Date of Publication: 16-06-2013 PRICE Rs. 2/-

POSTED ON 17-18 June 2013
R.N.I No. 2186/57

POSTAL REGN. NO. DL (C) -01/1195/2012-14
Licensed to Post Without Prepayment U (C) 160/2012-14

HAMARI ZABAN (WEEKLY)

ہفت روزہ

ہماری زبان

انجمن ترقی اردو (ہند) نئی دہلی

22-28 June 2013 — ۲۲ تا ۲۸/ جون ۲۰۱۳ء

Issue: 24, Vol.: 72 — شمارہ نمبر: ۲۴، جلد نمبر: ۷۲

عظیم افسانہ و ناول نگار منشی پریم چند کی تحریر 'دارا شکوہ کا دربار' کے عنوان سے یہ ایک اہم اور دل چسپ تحریر ہے، جسے شعبۂ اردو الہ آباد یونیورسٹی کے پروفیسر علی احمد فاطمی نے اشاعت کے لیے بھیجا ہے۔ ہم اُن کے شکریے کے ساتھ اسے نذر قارئین 'ہماری زبان' کر رہے ہیں۔ (ادارہ)

دارا شکوہ کا دربار

پہلی قسط

پریم چند

شہزادہ دارا شکوہ شاہ جہاں کے فرزند اکبر تھے اور اوصاف ظاہری و باطنی سے آراستہ۔ گو تھے تو ولی عہد مگر صاحب قران ثانی نے ان کی ذہانت و جدت، جوہر و کمالات دیکھ کر کل سلطنت کا نظم و نسق عملی طور پر انھی کے ہاتھوں میں دے رکھا تھا۔ وہ دوسرے شہزادوں کی طرح صوبہ جات ملحقہ کی صوبہ داری پر مامور نہ کیے جاتے بلکہ دارالخلافہ میں جلوہ افروز رہتے اور اپنے مشیروں کی مدد سے سلطنت کا بوجھ سنبھالتے۔ افسوس کا مقام ہے کہ گو ان کو ایک قابل، تجربہ کار سرمایہ ناز فرماں روا بنانے کے لیے عملیات کے مدرسے میں تعلیم دی گئی مگر ملک یا قوم کو ان کی ذات سے کوئی قابل یادگار فائدہ نہ پہنچا۔ مورخین کا قول ہے کہ اگر بجائے اورنگ زیب کے شہزادہ دارا شکوہ کو تخت ملتا تو ہندوستان ایک بڑی زبردست متفق سلطنت ہو جاتا۔ یہ قول گو کسی قدر ایک خاصۂ انسانی پر مبنی ہے کیوں کہ بعد مرگ لوگ اکثر آدمیوں کی وقعت کیا کرتے ہیں تاہم یہ دیکھنا بہت مشکل نہیں کہ اس میں راستی کی جھلک بھی پائی جاتی ہے۔

شہزادہ دارا شکوہ اکبر کا مقلد تھا۔ وہ محض نام کا اکبر ثانی نہ تھا۔ اس کے خیالات بھی ویسے ہی تھے اور ان خیالات کو واقعات کی صورت میں لانے کا طریقہ بھی بالکل ملتا ہوا نہیں بلکہ خیالات زیادہ پسندیدہ تھے اور ان کو عمل میں لانے کے طریقے، قواعد و اصول کے زیادہ پابند۔ اس کی دقیق نظری نے دیکھ لیا تھا کہ ہندوستان میں سلطنت کا مستقل طور پر قائم رہنا ممکن نہیں تاوقتیکہ ہندوؤں اور مسلمانوں میں ربط ضبط و اتحاد قائم نہ ہو جائے۔ وہ خوب جانتا تھا کہ جبر سے سلطنت کی جڑ نہیں جمتی۔ استحکام و بقائے سلطنت کے لیے ضرورت ہے اس کی کہ سلاطین پسندیدہ اصولوں اور محترمانہ قوانین سے رعایا کے دلوں میں گھر کر لیں۔ دلوں میں گھر کرنا بہ نسبت پتھر کے مضبوط قلعوں کے زیادہ اہم ہے اور رعایا کی محبت و جاں نثاری پر بہ نسبت افواج کے زیادہ بھروسہ رکھنا ضروری۔ دارا شکوہ نے ان اصولوں پر عمل کرنا شروع کیا تھا۔ اس نے ایک نہایت دل چسپ و نتیجہ خیز کتاب تصنیف کی تھی جس میں براہین قاطعہ سے یہ ثابت کیا تھا کہ مسلمانوں کے بقا کا دار و مدار ہندو مسلمان کے اتحاد و اتفاق پر ہے۔ اس کی نظروں میں بابا کبیر داس، گرو نانک جیسے آدمیوں کی بہت زیادہ وقعت تھی۔ یہ حضرات صلح کل کی تعلیم دیتے تھے۔

اس وقت ہندو مسلمان دونوں قومیں بمنزلہ دو بچوں کے تھیں۔ ایک نے چند ہی دن ہوئے دودھ چھوڑا تھا، دوسرا ابھی شیر خوار تھا۔ دارا شکوہ کا خیال تھا کہ اس شیر خوار بچے پر دوسرے بچے کو قربان کر دینا مصلحت کے خلاف ہے۔ گو اس کے دودھ کے دانت ٹوٹ گئے ہیں مگر اب وہ دانت نکلیں گے جو اور بھی زیادہ مضبوط ہوں گے۔ دانت نکلنے سے پہلے ہی چنے چبوانا انسانیت کے خلاف ہے، کیوں نہ دونوں بچوں کی ساتھ ساتھ پرورش ہو۔ اگر ایک کو دودھ زیادہ دیا جائے تو دوسرے کو اغذیہ لطیف کا استعمال کرایا جائے۔

شہزادہ دارا شکوہ نرا ہمہ دانی نہ تھا، اس کے سر علم و فضیلت کی پگڑی بھی بندھی تھی۔ اس نے ہند کے کل مستند زبانوں پر عبور حاصل کر لیا تھا، خصوصاً سنسکرت سے تو اسے الفت سی ہو گئی تھی۔ گھنٹوں حوض کے کنارے پاتنجلی یا گوتم کی فلاسفی لے کر پڑھتا، غور کرتا اور روتا۔ علاوہ ایشیائی زبانوں کے اس نے یورپ کی کئی زبانوں میں بھی مہارت بہم پہنچائی تھی۔ لاطینی، یونانی و عبرانی زبانوں میں اچھی دستگاہ تھی۔ جدید زبانیں مثل فرانسیسی، انگریزی و جرمنی جن کی ابھی اتنی ترقی نہ ہوئی تھی کہ ان کی خوبی و لطافت دوسری قوموں کو فریفتہ کرتی۔ اس کو اپنے اوپر مائل نہ کر سکیں۔ تاہم ان زبانوں سے وہ بالکل غیر مانوس نہ تھا۔ معمولی گفتگو سمجھ لیتا اور ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں اپنے خیالات کا اظہار بھی کر لیتا۔ جب غور کیجیے کہ وہ ایسے وسیع ملک کی حکومت کرتا اور اس کے ساتھ اپنی ذاتی تعلیم کے لیے ایسی کوششیں کرتا تھا تو حیرت معلوم ہوتی ہے کہ اس کے قویٰ کیسے تھے اور ذہن کیسا؟

دارا شکوہ اس غلطی میں نہ پڑا جس میں اکبر پڑا تھا۔ اکبر کے مشیر یا تو ہندو تھے یا مسلمان اور اس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ فریقین میں برابر چشمک چلا کرتی تھی۔ اگر اکبر جیسا مستقل مزاج فرماں روا نہ ہوتا تو اس جماعت کو ہرگز قابو میں نہ رکھ سکتا، جس میں مان سنگھ، ابوالفضل جیسے دل و دماغ کے لوگ تھے۔ صاف ظاہر ہے کہ ایسے مشیروں کی رائیں بھی غرض مندی سے خالی نہ ہوں گی۔ ہر ایک اپنی ہی قوم کی طرف کھینچے گا۔ اس خوف سے شہزادہ نے اپنے مشیر فرنگیوں سے لیے تھے کیوں کہ ان کے اوپر بے جا طرف داری کا گمان نہیں ہو سکتا تھا۔ پہلے اپنے درباریوں سے ہر ایک امر کی تحقیقات کرتا اور تب اپنے فرنگی مشیروں سے رائے لے کر فیصلہ کرتا۔

آج سہ پہر کا وقت ہے۔ شہزادہ دارا شکوہ کا دربار خاص آراستہ ہے۔ مشیران صاحب الرائے پر تکلف پوشاکیں پہنے درجہ بدرجہ رونق افروز ہیں۔ عین وسط میں ایک مرصع تخت ہے جس پر شہزادہ صاحب جلوس فرما ہیں۔ ان کے چہرے سے غور و خوض عیاں ہے۔ ہاتھ میں ایک فرمان شاہی ہے جس پر وہ رہ رہ کر مضطرب نگاہیں ڈالتے ہیں اور پھر کچھ سوچنے لگتے ہیں۔ تخت کے جانب راست ہنری بوزے ایک جواہر نگار کرسی پر بیٹھا ہوا ہے۔ یہ شہزادہ کا برگزیدہ مشیر ہے اور اس کی رایوں کی بڑی وقعت کی جاتی ہے۔ ہنری بوزے کے بغل میں دوسری مرصع کرسی پر مال پیکا بیٹھا ہوا ہے۔ تخت کے بائیں جانب ڈاکٹر برنیر فرانسیسی سیاح ایک کرسی پر بیٹھا ہوا کچھ سوچ رہا ہے اور اس کے بغل میں ایک دوسری کرسی پر پادری جوزرٹ پرتگالی سفیر متمکن ہے۔ تمام دربار میں غضب کی خاموشی طاری ہے اور دروازے چاروں طرف سے بند ہیں۔ مشیروں کی آنکھیں بار بار شہزادہ کی طرف اٹھتی ہیں مگر ان کو خاموش دیکھ کر پھر نیچے گر جاتی ہیں۔

تھوڑی دیر کے بعد شہزادہ صاحب نے فرمایا "حضرات! شاید آپ لوگوں کو ہم قندھار کی تباہی کی خبر ملی ہو"۔

اس مختصر سے جملے نے حاضرین کے چہروں کے رنگ اُڑا دیے۔ ہر شخص سناٹے میں آگیا اور کئی منٹ تک کسی کو بولنے کی ہمت نہ پڑی۔ آخر ہنری بوزے نے فرمایا "خانہ زادوں کو اس خبر کے استماع سے سخت افسوس ہوا، ہم سلطنت کی سچے دل سے ہمدردی کرتے ہیں"۔

پادری جوزریت "مگر سمجھ میں نہیں آتا کہ کیوں ناکامی ہوئی، گولہ اتارنے والے، فوج کو تربیت دینے والے تو زیادہ تر اہل فرنگ تھے، جن کے سروں پر حضرت مسیح کا سایہ تھا۔ ان کا ناکام رہنا خیال میں نہیں آتا"۔

یہ کہہ کر انھوں نے گلے سے مسیح کی ایک چھوٹی سی تصویر نکالی اور اس پر بڑے ادب کے ساتھ بوسہ دیا۔ اب ڈاکٹر برنیر کی باری آئی، پہلے انھوں نے ناظرین پر وہ نگاہ ڈالی جو راستی پسند بھی ہوتی ہے اور راست گو بھی۔ بعد ازاں فرمایا "حضرات! سچ پوچھیے تو مجھے اس مہم کی کامیابی میں پہلے ہی سے شک تھا۔ شہزادہ محی الدین اس کی قسمتوں کے مالک بننے کے قابل نہ تھے، اس لیے نہیں کہ ان میں یہ قابلیت نہیں بلکہ محض اس لیے کہ وہ اپنے تعصب کو دبا نہ سکتے تھے۔ مجھے یقین ہے کہ اس ناکامی کا باعث راجہ جگت سنگھ کی کنارہ کشی ہے"۔

اس کے بعد کئی منٹ تک سناٹا رہا۔

آخر شہزادہ صاحب نے خاموشی کو یوں دور کیا: "حضرات! مجھے اس سے کوئی بحث نہیں کہ اس ناکامی کا کیا اصلی سبب ہے اس امر کی چھان بین کرنا مناسب نہیں۔ آپ خوب جانتے ہیں کہ ایسا کرنا دانشمندی کے خلاف ہوگا۔

شہزادہ صاحب نے رک رک کر ان الفاظ کو ادا کیا۔ معلوم ہوتا تھا کہ اس وقت یہ دل میں ابھرنے والے خیالات سے پریشان ہو رہے ہیں جیسے کوئی اندرونی کشمکش میں پڑا ہو۔ دل چاہتا ہو کہنا بہتر ہے ایسا کر، مگر پھر پہلو بدل جاتا ہو۔ اپنی بات ختم کر کے شہزادہ نے حاضرین کو پُرمعنی نگاہوں سے دیکھا۔ زبان سے جو کچھ نہ ادا ہوا تھا آنکھوں نے ادا کر دیا۔ شہزادہ کا جواب پادری جوزریت نے یوں دیا: "جہاں پناہ! گستاخی معاف ہو، غلام کی رائے ناقص تو یہ ہے کہ اس ناکامی کے اسباب کو ایک پہلو سے غور کریں۔ خواہ یہ کتنا ہی ناگوار خاطر ہوا ہو تاکہ آئندہ کے لیے ان اسباب مزاحم کے دفعیہ کے لیے پیش بندیاں بھی کرلی جائیں۔ ناکامیابی ہم کو غلطیوں سے متنبہ کردیتی ہے۔ اس لحاظ سے میری نگاہوں میں کامیابیوں کی اتنی وقعت نہیں، جتنی کہ ناکامیوں کی۔ بیشک دنیاوی تجربے کا معلم ناکامی سے بڑھ اور کوئی نہیں"۔

یہ کہہ کر پادری صاحب نے حاضرین پر ایک پُرناز نگاہ ڈالی۔ گویا اس وقت انھوں نے کوئی غیر معمولی کام کیا ہو اور بیشک شہزادہ صاحب کی تقریر پر اعتراض جتانا معمولی کام نہ تھا۔ ان کی صلاح سب کو پسند آئی۔ شہزادہ صاحب نے بھی اتفاق کیا اور فرمایا: "پادری صاحب! آپ جو کچھ فرماتے ہیں بہت صحیح ہے۔ بیشک میں غلطی پر تھا، مگر شاید آپ نے میرے لہجے سے اتنا تو ضرور سمجھ لیا ہوگا کہ مجھ کو یہ غلطی دیدہ و دانستہ کرنی پڑتی ہے۔ مجھ کو اس ناکامی کے اسباب کی تحقیق کرنے میں فی نفسہ کوئی اعتراض نہیں مگر... مگر بعض اوقات چشم پوشی کرنا ہی عین مصلحت ہے، خصوصاً اس وقت جب کہ خاندان شاہی کے ایک رکن اعظم کی حرمت میں فرق آتا ہو، پس فی الحال ہم صرف اس امر کا تصفیہ کیا چاہتے ہیں کہ آیا قندھار سے ہمیشہ کے لیے دست بردار ہو جانا بہتر ہے، اس وقت تک قندھار کو دو مہمیں جا چکی ہیں مگر دونوں کی دونوں ناکام رہیں۔ آپ سے مخفی نہیں کہ ان دور دراز مہمات میں سلطنت کو کثیر تعداد صرف کا متحمل ہونا پڑتا ہے"۔

یہ سنتے ہی مشیران اور مصاحب پھر سر بہ زانو ہوئے، مسئلہ بیشک نہایت اہم تھا اور اس کے حل کرنے کے لیے غور و خوض کرنے کی بھی ضرورت تھی۔ چند منٹ تک تو سب کے سب استغراق کی حالت میں تھے۔ بعد ازاں مباحثہ یوں شروع ہوا:

ہنری بوزے: "قندھار پر مغل بادشاہوں کا قبضہ کب سے ہے؟"

ڈاکٹر برنیر: "شہنشاہ بابر کے عہد مبارک سے"۔

ہنری بوزے: "باوجود اس مدت دراز کی حکومت کے وہاں اس خاندان کا تسلط نہیں جما"۔

برنیر: "اس کی وجہ یہی ہے کہ شہنشاہ بابر کے بعد شاہان ہندستانی معاملات میں اس قدر مشغول رہنے لگے کہ قندھار پر کافی توجہ نہ رکھ سکے۔ اس وجہ سے دونوں ملکوں کے مابین تعلقات روز بروز کمزور ہونے لگے"۔

ہنری بوزے: "مختصراً اس کے یہ معنی ہیں کہ شاہان ہند کو قندھار سے اتنا فائدہ نہ تھا کہ اس کو بھی ہند کا ایک صوبہ سمجھ کر اس پر کافی توجہ رکھتے، اگر ایسا کرتے تو قندھار کبھی سر نہ اٹھا سکتا"۔

برنیر: بیشک شاہان ہند کا وقت زیادہ تر ہندو راجاؤں کو زیر کرنے اور صوبوں کے عناد و فساد کے فرو کرنے میں صرف ہوا کرتا تھا۔ حضرت عرش آشیانی نے البتہ ایک بار قندھار کو ایک مہم بھیجنی چاہی تھی مگر چند در چند رکاوٹوں سے عاجز آکر ارادہ ترک کر دیا۔ یہ قطعی طور پر کہنا کہ شاہان ہند کیوں قندھار سے غافل رہے، آسان نہیں۔ ممکن ہے کہ فاصلہ کے خیال نے باز رکھا ہو یا ناکامی کے خوف نے۔ یا خزانہ عامرہ کے افلاس نے"۔

مل پکار: "مگر کیا فی الحال وہی ضرورت درپیش نہیں، دکن کی پیچیدگیاں ایسی بڑھ گئی ہیں کہ ان کا سلجھانا اب بہت مشکل ہے اور اس کے کہنے کی ضرورت نہیں کہ فتح دکن فتح قندھار سے بدرجہا اہم ہے۔ ہند و قندھار کے درمیان جو فاصلہ تھا وہ پھر بھی کم نہ ہوا اور ناکامی کا خوف اب ہمیشہ سے زیادہ ہے، کیوں کہ اب فرمان ایران بھی قندھار کی مدد پر کمربستہ ہے"۔

پادری جوزریت: "درست فرمایا، مگر اب تخت ہند پر وہ بادشاہ نہیں جس کو فاصلہ یا ناکامی کا خوف اپنے ارادہ سے باز رکھ سکے۔ شاہان سابقہ کے زمانہ میں ہند کی سلطنت طفولیت میں تھی۔ اب اس کا شباب جوشوں پر ہے، اس زمانے میں ہند پر حضرت مسیح کی برکت نہ نازل تھی۔ صاحب قران ثانی مدظلہ اللہ تعالیٰ کے سر مبارک پر تو مسیح نے اپنے ہاتھوں سے شوکت کا تاج رکھ دیا ہے"۔

اس پُرزور دلیل پر شہزادہ دارا شکوہ کے لبوں پر بھی خفیف سی مسکراہٹ نمودار ہوگئی۔ ڈاکٹر برنیر جو دو تین منٹ سے غور میں تھے، بولے: "حضرات! سلطنت کی بقا کے لیے ضروری ہے کہ مخالف قوتیں اس کا لوہا مانیں۔ اس کی وقعت کا دوسرے کی نگاہوں میں کم ہو جانا اس کے لیے زہر قاتل ہے۔ اگر مخالفین کے دلوں میں اس کی ہیبت قائم ہو جائے تو پھر سلطنت اٹل ہے تاوقتیکہ اندرونی عوارض اس کی تباہی کا باعث نہ ہوں۔ دکن کی پیچیدگیاں بڑھتی ہی جاتی ہیں۔ مرہٹوں نے مفسدہ پردازی پر کمر باندھی ہے، جاٹوں نے بھی کچھ سر اٹھایا ہے۔ پس یہ وقت سلطنت ہند کے لیے نہایت نازک و خطرناک ہے، اس نازک وقت میں قندھار سے غافل ہو جانا ان مفسدوں کو .... اگر صاحب قران ثانی نے علی مردان خاں کو پناہ نہ دی ہوتی اور قندھار کو دو مہمیں روانہ نہ ہو چکی ہوتیں تو اس وقت اس ملک سے کنارہ کش ہو جانے میں چنداں نقصان نہ تھا، مگر جب دنیا پر یہ ظاہر ہو گیا کہ شہنشاہ ہند قندھار پر تسلط جمانا چاہتے ہیں اور اس کام پر آمادہ ہیں تو پھر اس ارادے سے ہٹنا سلطنت کے لیے نہایت خطرناک ہے۔ اب تو ہند کا یہ مقولہ ہونا چاہیے کہ لڑیں گے مریں گے، مگر قندھار کو نہ چھوڑیں گے۔ اگر اس وقت قندھار سے دست بردار ہو گئے تو مرہٹوں کو فطرتاً یہ خیال پیدا ہوگا کہ اگر ہم بھی اسی طرح فساد برپا کرتے رہیں تو قندھار کی طرح خود مختار ہو جائیں گے۔ شاہان دکن کو ہماری قوت کا اندازہ ہو جائے گا، والی ایران سمجھے گا کہ ہند میں اب دم نہیں تو وہ قندھار سے ہوتا کابل تک چلا آئے گا۔ کیا تعجب ہے ہند کی طرف بھی رخ کرے، پھر تو کابل کے افغان بلا سر اٹھائے ہرگز نہ مانیں گے۔ خلاصہ یہ کہ مہم قندھار سے اس وقت منہ پھیرنا نہایت خطرناک ہے"۔

ڈاکٹر برنیر کی گرم و مصلحت آمیز تقریر نے ناظرین پر خوب اثر پیدا کیا۔ شہزادہ صاحب تو سکتے میں آگئے۔ انھوں نے ابھی تک نہ سوچا تھا کہ قندھار سے کنارہ کش ہو جانے سے کیا کیا نتیجے پیدا ہوں گے، کیا کیا دشواریاں سامنے آئیں گی۔ اب ڈاکٹر برنیر کی زبان سے اس انجام بد کی کیفیت سن کر ان کے ہوش اڑ گئے۔ بارے ہنری بوزے کی اس تقریر نے دل کو کچھ ڈھارس دی۔ "حضرات! ڈاکٹر برنیر صاحب ایک غلط فہمی میں پڑ گئے۔ ان کو شاید نہیں معلوم کہ سلطنتوں کو اپنا سکہ بٹھانے کے لیے محض فوجوں کی ضرورت نہیں۔ ایسی سلطنتیں جن کا دارو مدار حرب و ہتھیار پر ہوتا ہے عرصے تک قائم نہیں رہتیں بلکہ ضرورت ہے اخلاقی قوت کی تاکہ رعایا کے دل میں اس کے جانب سے کوئی بدگمانی نہ پیدا ہو۔ سلطنت کا ہر ایک قول و فعل انصاف و راستی کی تائید میں ہو۔ کوئی اس کو حریص و طماع نہ سمجھے۔ جب تک سلطنت اس معیار کو نظروں کے سامنے نہ رکھے گی اس کا رعب نہ تو دلوں میں بیٹھے گا اور نہ دوسری مخالف طاقتیں اس کا لوہا مانیں گی۔ میں مانتا ہوں کہ سلطنت کو اولوالعزم ہونا چاہیے تاکہ رعایا کے دلوں میں بھی جوش پیدا ہو۔ اپنے حاکموں سے اولوالعزمیوں کا سبق سیکھیں۔ مگر یہ خیال رہے کہ اولوالعزمیاں بجا ہوں، بیجا اولوالعزمی اور حرص دونوں ہم معنی الفاظ ہیں۔ میں ایک تمثیل دے کر سمجھانا چاہتا ہوں کہ بجا اور بیجا اولوالعزمی سے میری کیا مراد ہے۔ یورپی اقوام آج بڑی سرگرمی سے جہاز بنا رہی ہیں۔ فوجوں کی تعداد روز بروز افزوں ہوتی چلی جاتی ہے۔ ان جہازوں پر دور دراز ملکوں کا سفر کیا جاتا ہے۔ ان ملکوں سے تعلقات پیدا کیے جاتے ہیں۔ خواہ تجارتی ہوں یا ملکی نوآبادیاں قائم کی جاتی ہیں۔ اس کو میں جائز اولوالعزمی کہتا ہوں۔ لیکن جب کسی کمزور قوم یا طاقت کو بزور شمشیر مغلوب کرنے کی کوشش کی جاتی ہے تو میں اس کو بے جا اولوالعزمی کہتا ہوں، کیوں کہ ناحق و ناراستی اس کے پردے میں چھپی ہوتی ہے۔ اب آپ خود فیصلہ کر سکتے ہیں کہ سلطنت ہند کا قندھار کو مہم بھیجنا بجا ہے یا بے جا۔ میں کہتا ہوں بے جا ہے، سراسر بے جا اور سخت افسوس کا مقام ہے کہ رعایا کا بھی یہی خیال ہے۔ گو اس کی آوازیں آپ کے کانوں تک نہیں پہنچتیں۔ اب غور کیجیے کہ اس خیال کا پیدا ہو جانا کیسا خطرناک ہے کیوں کہ جب دوسری دولتیں دیکھیں گی کہ ہند فاتح یا کشور کشائی پر آمادہ ہے تو وہ حفظ ماتقدم کے طور پر اپنی فوجیں بھی بڑھائیں گی اور کیا تعجب ہے کہ باہم متفق ہو کر ہندستان ہی پر چڑھ دوڑیں۔ جہاں پناہ! ڈاکٹر برنیر صاحب نے فرمایا کہ ہند کا اب یہ قول ہونا چاہیے کہ لڑیں گے، مریں گے مگر قندھار نہ چھوڑیں گے۔ یہ ان کے منہ سے نکلے ہوئے الفاظ ہیں۔ میں ان کی اجازت سے چند الفاظ اور بڑھائے دیتا

(بقیہ صفحہ ۶ پر)

مظہر امام: ایک مطالعہ

پہلی قسط

ڈاکٹر پریمی رومانی
1/3 نصیب نگر، جانی پور
جموں 180007

مظہر امام عصر حاضر کے ایک منفرد شاعر اور صاحب طرز نقاد ہیں۔ ایک زمانے میں وہ ترقی پسند کہلاتے تھے اور اپنی منفرد شاعری کی وجہ سے جانے اور پہچانے جاتے تھے۔ لیکن اس دور میں بھی اُن کی شاعری محض انقلابی بخار کی نذر نہیں ہوئی تھی۔ شعر و ادب کی شکست و ریخت زندگی کے ہر شعبے میں محسوس کی جا رہی ہے۔ آج کا شاعر اپنی تخلیقات میں اپنے تجربات، مشاہدات، انسان کی بے کلی، تنہائی اور بے قراری کا اظہار کرتا ہے۔ وہ ترقی پسندی کے بندھے ٹکے فارمولے شاعری کے حصار سے باہر نکل آیا ہے اور محض کسان اور مزدور کے آلام و مصائب کا رونا نہیں روتا بلکہ آج کے انسان کا المیہ پیش کرتا ہے۔ مظہر امام کے یہاں بھی دوسرے معاصرین مثلاً فضا ابن فیضی، حرمت الاکرام، وحید اختر، نازش پرتاپ گڑھی، باقر مہدی، خلیل الرحمن اعظمی کی طرح بدلتے ہوئے ماحول کے ساتھ تبدیلی آئی اور اس طرح سے وہ جدیدیت اور ترقی پسندی کے درمیان کی صورت اختیار کر گئے۔ وہ صرف جدید ہو کے نہیں رہے بلکہ کلاسکیت اور رومانیت کے گہرے مطالعے نے اُن میں زندگی کے نشیب و فراز کو سمجھنے کا شعور بھی عطا کیا۔ اُن کی شاعری کا خمیر اسی سے تیار ہوا۔

مظہر امام نے اپنی فکر کی گہرائی اور فن کی چابک دستی سے نہ صرف جوش، فراق، جگر، فیض احمد فیض، اختر الایمان، راشد، یوسف ظفر، منیب الرحمن اور خلیل الرحمن اعظمی وغیرہ جیسے شعرا کی روایت کو آگے بڑھایا بلکہ نئے شعرا پر بھی گہری چھاپ ڈال دی۔ یہی سبب ہے کہ وہ عصر حاضر کے نمائندہ شعرا میں ایک خاص مقام رکھتے ہیں۔ مظہر امام نے شاعری میں نئے تجربے بھی کیے۔ چناں چہ آزاد غزلوں کا تجربہ کر کے وہ اس کے موجد کہلائے اور نظم نگاری میں بھی انھوں نے مختلف ہیئتوں کو بروئے کار لایا۔ اُن کے ہاں ترائیلے بھی ہیں اور سانیٹ بھی، مسدس بھی اور نظم معرّا بھی۔ وہ آزاد نظم نگاری میں بھی اپنا جواب نہیں رکھتے اور مختصر نظم لکھنے میں بھی مہارت رکھتے ہیں۔ انھوں نے بچوں کے لیے بھی نظمیں لکھیں اور 'حیات آوارہ' میں مروّجہ بحر میں ایک رُکن کا اضافہ کر کے نظم لکھنے کا تجربہ بھی کیا۔ ان تمام نظم کی ہیئتوں میں اُن کے فکر و فن کی تازگی اور گہرائی ملتی ہے۔

مظہر امام نے تحقیق و تنقید کے میدان میں بھی اپنا لوہا منوایا۔ اس طرح سے انھوں نے نثر و نظم کی صورت میں جو بھی سرمایہ فراہم کیا ہے، وہ انفرادیت کا حامل ہے اور ہمیشہ وقعت کی نظروں سے دیکھا جائے گا۔

مظہر امام شاعر فردا ہیں۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ روایت کو فراموش کر چکے ہیں۔ انھیں روایات سے بھی ایک خاص تعلق ہے اور جدیدیت سے بھی گہرا لگاؤ۔ اس طرح سے اُن کی شاعری جدید اور قدیم دونوں کا سنگم ہے۔ بقول پروفیسر آل احمد سرور:

"ہمارے کلاسکی سرمائے پر اُن کی نظر گہری اور فکر و فن کے نئے میلانات سے بھی وہ اچھی طرح واقف ہیں"۔

مظہر امام کی شاعری اپنے معصوم انداز اور رویّے سے پہچانی جاتی ہے۔ اس میں احساس کا تیکھاپن بھی ہے اور برجستگی بھی، معنوی تہ داری بھی ہے اور درد و کسک بھی۔ اُن کی شاعری کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ اس میں تجربے کی وسعت اور لہجے کا عکس ملتا ہے۔ ایسی خصوصیات کی بنا پر انھیں افتخار کا درجہ حاصل ہے۔

مظہر امام کا تخلیقی سفر 'زخم تمنا' سے شروع ہو کر 'رشتہ گونگے سفر کا'، 'پچھلے موسم کا پھول' اور 'بند ہوتا ہوا بازار' جیسے شعری مجموعے کی مسافت طے کرتا ہوا اپنی منزل مقصود کی جانب رواں دواں ہے۔ 'زخم تمنا' میں ترقی پسند تحریک کے اثرات نمایاں طور پر ملتے ہیں۔ اس میں حسن و عشق کی کارفرمائی بھی ملتی ہے اور زندگی کے بارے میں بھی واضح تصورات سامنے آتے ہیں۔ غم دوراں اور غم جاناں کی جھلکیاں بھی دیکھنے میں آتی ہیں اور فلسفے کی بو باس بھی محسوس کی جا سکتی ہے۔ 'رشتہ گونگے سفر کا' کی شاعری اپنا ایک مخصوص اور منفرد انداز لیے ہوئے ہے۔ اُن کی اس شاعری میں احساس کی گرمی اور لہجے کا تیکھاپن موجود ہے۔ اس میں اشاریت ہے اور سادگی اور پُرکاری بھی۔ درد و کرب کا پہلو بھی ہے اور خلوص اور والہانہ پن بھی۔ یہی خصوصیات انھیں اپنے معاصرین سے منفرد مقام عطا کرتی ہیں۔ 'رشتہ گونگے سفر کا' میں بھی 'زخم تمنا' کی طرح بعض ہلکے پھلکے اشعار ملتے ہیں لیکن مظہر امام کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے اپنے فکر و فن پر بھی کوئی آنچ نہیں آنے دی۔ وہ مشکل اور سنگلاخ زمینوں میں بھی سلاست اور روانی پیدا کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ مظہر امام کے ہم عصر شاعر بلراج کومل کو مظہر امام کی شاعری میں بنیادی مسئلہ ترسیل کا نظر آتا ہے۔ ترسیل اُن کے لیے بڑا وسیع معنی رکھتی ہے۔ اس میں ایک انسان کے آدرش، اصول اور ذمہ داریوں کا ایک اہم رول ہوتا ہے۔ وہ مظہر امام کے شعری مجموعے پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"مظہر امام کے تازہ ترین کلام (نظم و غزل) میں بنیادی مسئلہ Communications یعنی ترسیل کا ہے۔ ترسیل جس کے لیے انسان ترستا ہے اور آدرشوں اور اصولوں سے اپنا رشتہ استوار کرنا چاہتا ہے، گھر بسانا چاہتا ہے تو تازہ بستیوں کی تلاش کرنا چاہتا ہے۔ مشکل یہ ہے کہ جستجو کے ہر موڑ پر ترسیل ناکام ہو جاتی ہے۔ بیزاری، گھٹن، جھلاہٹ، خود زخمی۔ مظہر امام کے مجموعۂ کلام کی اکثر نظموں میں ازدواجی زندگی کی بےبسی، گھٹن اور سنگین خلائی کا ذکر ملتا ہے"۔

'رشتہ گونگے سفر کا' میں بہت کم نظمیں ملتی ہیں۔ ان نظموں میں بھی ایک خاص انفرادیت جھلکتی ہے۔ ایک صبح مری ہوئی، پوسٹ نہ ہونے والا خط، کھلے آسمان کے نیچے، گوشت کا نقش، پھیلے ہوئے ہاتھ، یوں تو صرف چند نظمیں ہیں لیکن ان کے مطالعے سے ایک اور پہلو سامنے آتا ہے۔ ان نظموں میں مظہر امام کا خلوص جگہ جگہ ٹپکتا ہے۔ وہ حقیقت دریافت کرنے اور ان کو بروئے کار لانے میں کوئی کسر باقی نہیں رکھتے۔ ان نظموں میں تضاد اور تکرار کا کوئی پہلو نہیں ملتا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ مظہر امام علامتی اسلوب رکھتے ہیں۔ انھوں نے علامتوں کے ذریعے سے زندگی کی گہرائیوں کو نہ صرف جاننے کی کوشش کی ہے بلکہ حقائق کی بازیافت بھی کی ہے۔ بعض نظموں میں ایسا طنزیہ لب و لہجہ ملتا ہے جو سن کر دل میں اُتر جاتا ہے۔

'پچھلے موسم کا پھول' مظہر امام کی غزلوں کا مجموعہ ہے جو ۱۹۸۸ء میں شائع ہوا۔ اس مجموعے کا آغاز 'حمد' سے ہوتا ہے۔ اس کے بعد غزلوں کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ ان میں سے بیشتر غزلیں مظہر امام کے قیام کشمیر کے دوران 'کشمیری غزلیں' کے عنوان سے اردو کے معیاری رسائل میں طبع ہو چکی ہیں۔ اس مجموعے پر بہار، مغربی بنگال، اتر پردیش اور جموں و کشمیر اکادمیوں نے مظہر امام کو گراں قدر انعامات سے نوازا۔ ان کے علاوہ ساہتیہ اکادمی نے بھی مظہر امام کو گراں قدر اعزاز سے نوازا۔ اس طرح سے اس مجموعے کی اہمیت کا بخوبی پتا چلتا ہے۔

'پچھلے موسم کا پھول' مظہر امام کے شعری مجموعوں 'زخم تمنا' اور 'رشتہ گونگے سفر کا' سے الگ منفرد حیثیت رکھتا ہے۔ 'پچھلے موسم کا پھول' تک آتے آتے مظہر امام نے تخلیق کے بہت سارے مراحل طے کیے۔ یہ غزلیں علامتوں سے مالا مال ہیں۔ اس میں مظہر امام نے زمانے کے درد و کرب کا کھل کر اظہار کیا ہے۔ یہاں بھی کہیں کہیں اُن کا لہجہ اور اُن کا ڈکشن طنزیہ ہے، لیکن مظہر امام کا کمال ہے کہ یہ طنز لطیف احساس کے ساتھ سامنے آتا ہے۔ 'پچھلے موسم کا پھول' میں مظہر امام نئی حیاتوں کے ساتھ سامنے آتے ہیں۔

مظہر امام کی غزلوں میں نغمگی کے علاوہ فکر و خیال کی بلندی بھی ہے۔ اس بات میں کوئی شک نہیں کہ وہ جذبے کے شاعر ہیں۔ وہ ہر وقت نئے جذبات کے ساتھ جلوہ گر ہوتے ہیں اور نئے تقاضوں کو برتنے میں پیش پیش رہتے ہیں۔ اردو کے خوشنما الفاظ کے ساتھ ہندی کے برمحل الفاظ کے استعمال سے وہ اپنی غزلوں میں قوس و قزح کی طرح کئی رنگ بھرتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ الفاظ کی دروبست پر پوری قدرت رکھتے ہیں۔ ان کے یہاں علامت نگاری، پیکر تراشی اور تشبیہات و استعارات کے ساتھ ساتھ خوشنما تراکیب بھی دیکھنے میں آتی ہیں۔ 'پچھلے موسم کا پھول' ان ہی خصوصیات کا حامل شعری مجموعہ ہے۔

'بند ہوتا ہوا بازار' مظہر امام کی نظموں کا مجموعہ ہے جو ۱۹۹۳ء میں موڈرن پبلشنگ ہاؤس دریا گنج نئی دہلی سے شائع ہوا۔ یہ دراصل مظہر امام کی نظموں کا انتخاب ہے، جس میں اُن کی نئی اور پرانی دونوں قسموں کی نظمیں شامل ہیں۔ چوں کہ مظہر امام بطور نظم گو شاعر بھی معروف ہیں، اس لیے انھوں نے غزلوں کی طرح نظموں میں بھی اپنے خیالات کی دنیا آباد کی ہے۔ یہ نظمیں اُن کے شعری مجموعوں 'زخم تمنا' اور 'رشتہ گونگے سفر کا' میں شامل ہیں اور چند نظمیں مختلف رسائل میں بکھری ہوئی ہیں۔ اس لحاظ سے ان کا یہ ایک نیک قدم ہے کہ ماڈرن پبلشنگ ہاؤس نے ان نظموں کو یکجا کر کے اور ان کا انتخاب کر کے 'بند ہوتا ہوا بازار' کے نام سے کتابی صورت میں منظر عام پر لایا۔ اس طرح سے مظہر امام کی نظموں پر کام کرنے والوں کے لیے راہیں استوار ہوں گی۔

مظہر امام بہ حیثیت ایک نثر نگار

(بقیہ صفحہ ۷ پر)

اردو دنیا

نام کی تختیاں ہندی کے ساتھ اردو میں بھی لکھوائی جائیں

نئی تعلیمی مرکز کے ایک وفد نے ضلع مجسٹریٹ سے ملاقات کرکے عرض داشت پیش کی

باپوڑ (۲۹ رمئی)۔ نئی تعلیمی مرکز کے ایک وفد نے ضلع مجسٹریٹ سے ملاقات کرکے سبھی سرکاری دفاتر میں افسران کے نام کی تختیاں ہندی کے ساتھ اردو میں بھی تحریر کرنے کی مانگ کرتے ہوئے ایک عرض داشت پیش کی۔ وفد میں شامل نئی تعلیمی مرکز لکھنؤ کے عبدالنصیر ناصر نے بتایا کہ ۸ اکتوبر ۱۹۸۹ء کے سرکاری گزٹ کے تحت اردو کو اترپردیش میں دوسری سرکاری زبان کا درجہ حاصل ہوا تھا، اس کے باوجود آج تک اردو کے ساتھ سوتیلا رویہ اختیار کیا جارہا ہے۔ عبدالنصیر ناصر نے اے ڈی ایم جے پرکاش پٹیل، ایس پی ڈاکٹر اشوک راٹھور اور بی ایس اے نریندر شرما سے تحریری طور پر شکایت درج کرائی ہے کہ سرکاری اسکولوں اور دفتروں میں کہیں بھی کسی بھی جگہ اردو کا کوئی استعمال نہیں ہورہا ہے جو کہ افسوسناک ہے جب کہ اردو کا دم بھرنے والی سرکار کے سربراہ ملائم سنگھ یادو اور صوبے کے وزیر اعلا اکھلیش یادو نے اپنے انتخابی منشور میں بھی اردو کو اس کا واجب حق دلانے کی بات کی ہے۔
(انقلاب۔ دلی)

مدھیہ پردیش بھوج اوپن یونیورسٹی میں شعبۂ اردو قائم کیا جائے

بھوپال (پریس ریلیز)۔ قلم کار پریشد کے صدر ڈاکٹر علی عباس امید نے مدھیہ پردیش کے گورنر عزت مآب رام نریش یادو سے درخواست کی ہے کہ مدھیہ پردیش بھوج اوپن یونیورسٹی میں اردو زبان وادب کی تعلیم بھی شروع کی جائے۔ امید صاحب نے لکھا ہے کہ وہاں ایسے کئی مضامین ہیں جن میں طلبہ کی تعداد انگلیوں سے بھی کم ہے مگر ان کی تعلیم کا بھی معقول انتظام ہے۔ بھوج اوپن یونیورسٹی میں اردو جو کہ اس ملک کی مقبول ترین زبان ہے اسے فراموش کیا جانا افسوسناک ہی نہیں غیر منصفانہ بھی ہے۔ لہٰذا یونیورسٹی کے چانسلر انتظامیہ کو ہدایت دیں کہ بلاتاخیر بھوج اوپن یونیورسٹی میں شعبۂ اردو قائم کیا جائے۔

ڈاکٹر امید نے گورنر صاحب کا اس بات کے لیے شکریہ ادا کیا ہے کہ انھوں نے نومبر ۲۰۱۲ء میں مدھیہ پردیش اردو اکادمی کے بجٹ میں اضافہ کرنے کی ان کی درخواست حکومت کو بھیجی اور پچیس لاکھ کا اضافہ ہوا۔ اس لیے ان کی منصف مزاجی سے امید ہے کہ بھوج یونیورسٹی میں بھی اردو کو ضرور جگہ ملے گی۔

گورنمنٹ جونیر کالج ظہیر آباد میں اردو میڈیم سائنس گروپ کو مستقل کرنے کے احکام جاری

ظہیر آباد، آندھرا پردیش (۲۹ رمئی)۔ کے نرسمہا (صدر ٹاؤن کانگریس ظہیر آباد) کے بموجب گورنمنٹ جونیر کالج ظہیر آباد میں اردو میڈیم سائنس گروپ کو اس سال سے مستقل کیے جانے کے احکام کمشنر بورڈ آف انٹرمیڈیٹ کی جانب سے جاری کیے گئے ہیں جس کی کاپی اخباری نمائندوں کو دکھاتے ہوئے انھوں نے کہا کہ اردو میڈیم سائنس گروپ جو کارپس فنڈس کے ذریعے چلایا جارہا تھا لیکن اب اس کو مستقل کردیا گیا۔ واضح رہے کہ گزشتہ ہفتہ 'منصف' اخبار میں شائع خبر کے فوری اثر کے ساتھ حلقہ اسمبلی ظہیر آباد کی نمائندگی کرنے والی ڈاکٹر جے گیتا ریڈی (وزیر بھاری صنعتیں وشکر سازی) نے اردو میڈیم سائنس گروپ کو مستقل کرنے کی کارروائی کو تیزی سے آگے بڑھاتے ہوئے جاریہ سال میں ہی کمشنر بورڈ آف انٹرمیڈیٹ سے احکام جاری کروادیے جس کے لیے مقامی اقلیتی قائدین محمد معز، محمد ماجد وغیرہ گیتا ریڈی سے ایک عرصے سے نمائندگی میں لگے ہوئے تھے۔ اس کامیابی کے بعد انھوں نے ڈاکٹر ریڈی سے اظہار تشکر کرتے ہوئے امید ظاہر کی کہ آئندہ بھی وہ اسی طرح سے اردو کی ترقی کے لیے بہتر کارکردگی جاری رکھیں گی۔
(منصف۔ حیدرآباد)

رام پور میں انتظامیہ کی اردو دشمنی

رام پور (۲۹ رمئی)۔ رام پور اترپردیش کے ان 14 اضلاع میں شامل ہے جہاں ووٹرلسٹیں تک الیکشن کمیشن نے اردو میں شائع کرنے کا حکم دیا ہے۔ حکومت اترپردیش نے صوبے میں اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ عطا کردیا ہے لیکن تمام افسروں کے دفاتر اور رہائش گاہوں کے باہر اردو میں نام اور عہدہ لکھنے کا حکم نامہ ضرور جاری کردیا ہے لیکن رام پور میں اردو والوں کی بے حسی کا عالم یہ ہے کہ وہ کاغذی طور پر اردو کی فلاح وبہبود اور ترقی کے لیے بیانات تو جاری کرتے ہیں لیکن عمل سے کوسوں دور ہیں۔ مگر پائیگا کی عمارت میں واقع کمروں کے باہر محکموں اور افسران کی تختیاں انگریزی اور ہندی میں لگی ہوئی ہیں اور افسران کی اردو دشمنی کا عالم یہ ہے کہ بورڈ میٹنگ کے ایجنڈے بھی اردو میں جاری ہونا نہ صرف یہ کہ بند ہوگئے بلکہ ایگزیکیٹو افسر نے اردو میں ایجنڈہ جاری کرنے پر پابندی لگادی ہے۔ اردو وال طبقے میں اردو کو مٹائے جانے پر نہ تو اعتراض ہے اور نہ ہی ان میں احتجاج کرنے کی جرأت ہے۔
(اردو ایکشن۔ بھوپال)

اردو میڈیم سرکاری مدارس میں اساتذہ کی خالی اسامیوں پر تقررات کا مطالبہ

حیدرآباد (۲۳ رمئی)۔ کانگریس اقلیتی قائدین نے ڈی ای او حیدرآباد سے مطالبہ کیا ہے کہ سرکاری اردو میڈیم مدارس کی صورت حال کا جائزہ لینے کے لیے ضلع کلکٹر کی صدارت میں فی الفور اجلاس طلب کریں اور اردو مدارس میں اساتذہ کی خالی اسامیوں پر تقررات اور مدارس میں فرنیچر کے علاوہ بنیادی سہولتوں کی فراہمی کے لیے اقدام کریں۔ اقلیتی قائدین جناب سید معراج علی، محمد رحیم قریشی، عبدالخالق اور محمد یوسف خاں نے ان اہم مسائل پر ارکان اسمبلی کو بھی توجہ دینے کی اپیل کی ہے۔
(رہنمائے دکن۔ حیدرآباد)

اردو میڈیم اقامتی جونیر کالجوں میں انٹرنس ٹسٹ کی شرط ختم

حیدرآباد (۲۳ رمئی)۔ آندھرا پردیش ریزیڈینشیل ایجوکیشنل انسٹی ٹیوشنس سوسائٹی کے تحت چلائے جانے والے اردو میڈیم اقامتی جونیر کالجوں میں داخلوں کے لیے انٹرنس ٹسٹ کا لزوم ختم کردیا گیا اور اس طرح اب ان اقامتی اردو میڈیم جونیر کالجوں میں انٹرنس ٹسٹ کے بغیر میرٹ کی بنیاد پر داخلے دیے جائیں گے۔ اس سلسلے میں مسٹر گوپال ریڈی (سکریٹری اے پی ریزیڈینشیل ایجوکیشنل انسٹی ٹیوشنس سوسائٹی حیدرآباد) نے گزشتہ دن احکام جاری کیے۔ جناب محمد مسعود احمد (کارگزار صدر تلنگانہ اردو ٹیچرس یونین حیدرآباد) نے اپنے ایک بیان میں بتایا کہ ریاست کے پانچ مقامات کھمم، کرنول، نظام آباد، حیدرآباد کے علاوہ وائی ایم پاڈو (ضلع چتور، صرف لڑکیوں کے لیے) میں قائم ان اردو میڈیم اقامتی جونیر کالجوں میں داخلوں کے لیے انٹرنس ٹسٹ کو لازمی قرار دے کر انٹرنس ٹسٹ کے ذریعے داخلے دیے جارہے تھے لیکن اس سلسلے میں گزشتہ ایک عرصے سے مسلسل مختلف سیاسی جماعتوں، اساتذہ تنظیموں بشمول تلنگانہ اردو ٹیچرس یونین، دیگر اردو تنظیموں کی جانب سے انٹرنس ٹسٹ کو برخواست کرنے کا مطالبہ کرتے ہوئے موثر نمائندگی کی گئی جس کی روشنی میں اس مرتبہ انٹرنس ٹسٹ کو ختم کرکے راست میرٹ کی بنیاد پر داخلہ دینے کا فیصلہ کیا گیا۔ انھوں نے مزید کہا کہ ان اقامتی جونیر کالجوں میں اقلیتی طلبہ وطالبات کے لیے مفت تعلیم کی سہولت کے ساتھ ساتھ مفت رہائش و طعام وغیرہ کی بھی سہولت فراہم کی گئی ہے اور علاقہ واری اساس پر ہی انٹرمیڈیٹ سال اول میں دسویں جماعت کامیاب طلبہ وطالبات کو میرٹ کی بنیاد پر داخلے دیے جائیں گے۔ مسٹر مسعود احمد نے بتایا کہ ان اردو میڈیم اقامتی سرکاری جونیر کالجوں میں داخلوں کے لیے درخواست داخل کرنے کی آخری تاریخ (آن لائن یا راست) ۱۰ رجون مقرر کی گئی ہے۔ خواہش مند طلبہ وطالبات آن لائن درخواستوں کے لیے www.apresidential.gov.in ویب سائٹ پر ملاحظہ کرسکتے ہیں۔ انھوں نے اردو میڈیم اقامتی جونیر کالجوں میں داخلوں کے لیے طلبہ وطالبات کی بہتر رہنمائی کرنے اور ان کی ہمت افزائی کرتے ہوئے ترغیب دینے کی اردو میڈیم مدارس کے صدر مدرسین اور اردو تنظیموں اور ٹیچرس یونینوں کے قائدین سے خصوصی اپیل کی تاکہ اردو میڈیم اقامتی جونیر کالجوں کی سہولتوں سے نہ صرف بھرپور استفادہ کیا جاسکے بلکہ ان کالجوں میں سیٹوں کو پر کرنے میں مددگار ثابت ہوسکیں۔
(سیاست۔ حیدرآباد)

کنٹریکٹ کی بنیاد پر رکھے گئے اردو اساتذہ کی مدت کار میں توسیع کا مطالبہ

نئی دہلی (۲۹ رمئی)۔ دہلی حکومت کے ذریعے ۱۱ اکتوبر ۲۰۱۲ء کو جاری کیے گئے سرکولر کے تحت جہاں ایک طرف سبھی 55 اسکولوں میں اردو کے 100 اساتذہ کی تقرری نہیں ہوپائی وہیں جن اسکولوں میں اردو کے اساتذہ مقرر کیے گئے ہیں انھوں نے مطالبہ کیا ہے کہ انھیں کم از کم ایک سال کے لیے مقرر کیا جائے، کیوں کہ کنٹریکٹ ختم ہونے کے بعد دوبارہ درخواست کرنے میں کئی ماہ لگ جاتے ہیں اور اس دوران طلبہ کی پڑھائی متاثر ہوتی ہے۔ قومی کمیشن برائے اقلیتی تعلیمی ادارہ جات کے کوآرڈینیٹر شہادت علی، چودھری عباس علی، سماجی کارکنان امان اللہ اور منظور علی خاں نے مطالبہ کیا ہے کہ ان اساتذہ کی مدت کار میں ایک سال کی توسیع کردی جائے۔ دوسری جانب اردو کو دوسری سرکاری زبان نہ ماننے پر جنوبی مغربی زون کے ڈی ڈی ای کے خلاف قومی کمیشن برائے اقلیتی تعلیمی ادارہ جات میں شکایت درج کرادی گئی ہے۔ سرو شکشا ابھیان کے تحت حکومت نے دہلی کے ایسے 55 اسکولوں میں اردو سیکشن کھولنے کی منظوری دی تھی جن میں پہلے اردو نہیں پڑھائی جاتی تھی۔ ان اسکولوں میں 100 اردو اساتذہ کا تقرر کرنا تھا، مگر ڈیڑھ سال سے زائد کی مدت گزرنے کے بعد بھی اس سرکولر پر پوری طرح عمل نہیں ہوپایا۔ اب تک کی رپورٹ کے مطابق تقریباً 70 اساتذہ کی تقرری ہوپائی تھی جن کا کنٹریکٹ ۱۰ رمئی کو ختم ہوگیا۔ اب انھیں نئے سرے سے کنٹریکٹ لینا پڑے گا جس میں کئی ماہ لگ جاتے ہیں۔ اس دوران انھیں تنخواہ بھی نہیں مل پاتی۔ ان اساتذہ نے اپنا درد بیان کرتے ہوئے کہا کہ ۱۰ رمئی کو ہمارا کنٹریکٹ ختم ہوگیا ہے، یکم جولائی سے اسکول کھلیں گے مگر اس دوران طلبہ اردو پڑھنے سے محروم رہیں گے کیوں کہ نئے اساتذہ کی تقرری میں کافی وقت لگتا ہے۔ ستمبر یا اکتوبر میں اردو اساتذہ

شعبۂ اردو کرناٹک یونیورسٹی کو
بند کرنے کی کوشش کی گئی تو احتجاج کیا جائے گا

دھارواڑ (۲۴ مئی)۔ کرناٹک یونیورسٹی دھارواڑ کے سنڈیکیٹ اجلاس میں یہ فیصلہ لیا گیا کہ جس شعبے میں دس سے کم طلبہ ہوں گے وہ شعبہ بند کردیا جائے گا۔ وائس چانسلر نے اس بات کو صاف کرتے ہوئے یہ کہا کہ مراٹھی، طلاشی اور شعبۂ اردو کو بند کیا جائے گا۔ اس سلسلے میں تحریک فروغ اردو دھارواڑ کی ایک خصوصی میٹنگ طلب کی گئی جس میں شہر کے باشعور اور اردو داں حضرات نے حصہ لیا۔ تحریک فروغ اردو کے صدر شکیل لالمیاں نے کہا کہ اگر شعبۂ اردو کو بند کرنے کی کوشش کی گئی تو شہر میں سخت احتجاج کیا جائے گا۔ انھوں نے کہا کہ کرناٹک یونیورسٹی اور کرناٹک کالج میں یہ شعبہ کئی سالوں سے چلتا آرہا ہے اور یہاں سے کئی طلبہ وطالبات نے ایم اے اور پی ایچ ڈی کی ڈگریاں حاصل کی ہیں۔ شہر دھارواڑ میں اردو پرائمری اسکولوں اور کالجوں کی بھی کمی نہیں ہے۔ اس سال کرناٹک یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں تقریباً 17 طلبہ وطالبات زیر تعلیم ہیں اس کے باوجود بھی اس شعبے کو بند کرنے کی تجویز کرنا اردو دشمنی ہے۔ میٹنگ میں تو یہ طے کیا گیا ہے کہ جس شعبے میں دس سے کم طلبہ ہوں گے وہ شعبہ بند کردیا جائے حالاں کہ شعبۂ اردو میں تو دس سے زیادہ طالب علم تعلیم حاصل کررہے ہیں۔ وی۔ سی۔ کے اعلان سے یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اردو دشمن ہیں۔ شکیل صاحب نے ریاست کے تمام اردو والوں سے اپیل کی کہ اگر وہ متحد ہوکر اس فیصلے کے خلاف احتجاج کریں تو اس شعبۂ اردو کو بچایا جاسکتا ہے۔ انھوں نے اطلاع دی ہے کہ اگر شعبۂ اردو کے ساتھ ناانصافی ہوگی تو ریاستی سطح پر احتجاج کیا جائے گا۔ اس میٹنگ میں ڈاکٹر آسمان، ڈاکٹر شبانہ بلاری، عبدالرشید شاد، اسماعیل سوداگر، سرفراز پٹھان، بشیر لنگلیکوڑہ ربہان، تاج الدین شیخ اور دیگر حضرات موجود تھے۔
(سالار، بنگلور)

اردو، ہندی اساتذہ کی بحالی کے لیے نمائندگی

اسلام پور (۱۵ مئی)۔ چودھری محمد یوسف ہائی اسکول، اسلام پور میں اردو اور ہندی اساتذہ کی بحالی کے لیے مذکورہ ہائی اسکول کے اردو، ہندی میڈیم بچوں نے گزشتہ ۱۴ مئی کو ایس ڈی او اسلام پور کو ایک میمورنڈم پیش کیا۔ میمورنڈم میں مطالبہ کیا گیا ہے کہ ایک عرصے سے چودھری محمد یوسف ہائی اسکول اسلام پور میں اردو، ہندی اساتذہ کی تقرری معطل کی ہے۔ اساتذہ کی بحالی کے لیے بار بار متعلقہ انتظامیہ کو آگاہ بھی کیا گیا ہے، لیکن اس کے باوجود اس اسکول میں اردو، ہندی میڈیم اساتذہ کی بحالی نہیں کی گئی ہے لہٰذا ایس ڈی او اسلام پور سے گزارش ہے کہ وہ اردو ہندی بچوں کا خیال رکھتے ہوئے اردو، ہندی اساتذہ کی بحالی کو جلد از جلد یقینی بنائیں۔ محمد فیضان جو اس اسکول کا ایک اردو میڈیم طالب علم ہے، اس نے دونوں میڈیم کے بچوں کی طرف سے نمائندگی کرتے ہوئے کہا کہ متعلقہ انتظامیہ کو اس سے قبل کئی بار اساتذہ کی بحالی کے لیے آگاہ کیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں اس اسکول کے سکریٹری، ہیڈ ماسٹر اور یہاں تک کہ ایس ڈی او موصوف کو بھی کئی بار میمورنڈم دیا گیا ہے لیکن ہنوز اس پر کوئی کارروائی نہیں ہوئی۔ فیضان نے مزید کہا کہ ماضی قریب میں اس سلسلے میں چودھری عبدالکریم سے بھی رجوع کیا گیا ہے لیکن کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔ فیضان نے یہ بھی کہا کہ ہم نے اس کے لیے مغربی بنگال اردو اکادمی سے بھی رابطہ کیا ہے لیکن وہاں سے بھی مایوسی ہاتھ لگی ہے۔ اس پر مزید طرہ یہ کہ اسلام پور سب ڈویژن میں اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ مل چکا ہے۔ (آبشار، کلکتہ)

کا تقرر ہوجائے گا اور تقریباً تین ماہ تک طلبہ اردو نہیں پڑھ پائیں گے۔

غور طلب ہے کہ حسینیہ ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر سوسائٹی کے جنرل سکریٹری مہرالدین نے جنوبی مغربی پی ڈون کے ڈپٹی ڈائرکٹر آف ایجوکیشن جنگ بہادر سنگھ سے آر ٹی آئی کے ذریعے چند سوالات کیے، جن میں یہ سوال بھی شامل تھا کہ کیا اردو اور پنجابی کو دوسری زبان کا درجہ حاصل ہے یا نہیں؟ ۲۱ اپریل ۲۰۱۳ء کو موصول ہوئے جواب میں کہا گیا ہے کہ 'پنجابی بھاشا اور اردو بھاشا دونوں میں سے کسی بھی بھاشا کو دوسری بھاشا کا درجہ نہیں دیا گیا ہے۔ جب نمائندے نے اس سلسلے میں جنگ بہادر سے بات کی تو انھوں نے کہا کہ اردو دوسری نہیں بلکہ تیسری سرکاری زبان ہے۔ جنگ بہادر کے تعلق سے سماجی کارکنوں نے بتایا تھا کہ اس نے اپنے زون میں اردو سیکشن کے قیام میں بھی رخنہ اندازی کی ہے۔
(انقلاب، دہلی)

انگریزی میڈیم میں تعلیم حاصل کرنے والے بچوں کے لیے
اردو مضمون کی تدریس کا انتظام کرنے کی اپیل

بیدر (۴ مئی)۔ یاران ادب بیدر کے صدر جناب محمد امیر الدین امیر اور جنرل سکریٹری محمد یوسف رحیم بیدری اور بزم غزالاں بیدر کی صدر محترمہ نوشاد بیگم نے اپنے مشترکہ بیان میں اپیل کی ہے کہ والدین اپنے بچوں کا داخلہ اردو میڈیم اسکولوں میں کروائیں۔ اس لیے کہ مادری زبان میں تعلیم کی بے انتہا اہمیت ہے۔ بچے کی بہتر نشوونما، الفاظ کی معنویت اور تلفظ پر عبور وغیرہ اسی وقت حاصل ہوتا ہے جب بچہ اپنی مادری زبان میں تعلیم حاصل کرے۔ انگریزی یا دیگر میڈیم میں تعلیم حاصل کرنے والے طلبہ کی لسانی نشوونما میں کمی واقع ہوتی ہے۔ آئندہ وہ دیگر زبانوں کو جلد از جلد سیکھ نہیں پاتا اس لیے ہر بچے کو اپنی مادری زبان میں تعلیم حاصل کرنا چاہیے۔ محمد یوسف رحیم بیدری نے کہا کہ اردو میں جو وسعت ہے وہ کسی دیگر زبان میں نہیں ہے۔ نوشاد بیگم صاحبہ کا خیال تھا کہ خواتین اپنے بچوں کو اردو سے تعلیم دلانے میں اہم رول ادا کرسکتی ہیں۔ محمد امیر الدین امیر نے اردو اساتذہ پر تنقید کرتے ہوئے کہا کہ چند ایک اساتذہ ایسے ہیں جو اپنے بچوں کو اردو تعلیم نہیں دلاتے۔ موصوف نے یہ بھی سوال کیا کہ ماہ مئی کے ابتدائی ہفتے سے ہی طلبہ کو داخلوں کی ترغیب دی جاتی ہے۔ شہر میں ایسے کتنے اردو میڈیم سرکاری اسکول ہیں جو طلبہ کو اپنے اسکولوں میں داخلوں کی ترغیب دینے کے لیے محلہ محلہ گھوم رہے ہیں۔ امیر الدین امیر نے کہا کہ اردو اساتذہ کی یہ غفلت لمحۂ فکریہ ہے۔ اپنے بیان کے آخر میں یاران ادب بیدر نے اردو کے چاہنے والوں سے اپیل کی ہے کہ براہ کرم اپنے بچوں کو اردو میڈیم سے تعلیم دلائیں۔ انگریزی میڈیم میں پڑھانے والے والدین سے بھی التماس ہے کہ وہ اپنے بچوں کے لیے اسکول انتظامیہ سے اردو مضمون کی تعلیم کا مطالبہ کریں اور یہ کام نہایت ہی آسان ہے۔ والدین کے مطالبے کے نتیجے میں پرائیویٹ انگریزی اسکول اردو مضمون کی تعلیم کا انتظام ضرور کریں گے۔
(رہنمائے دکن، حیدرآباد)

آغا جانی کشمیری کی سوانح حیات
'سحر ہونے تک' اردو کا ایک اعلا شاہکار ہے

کلکتہ (پریس ریلیز)۔ معروف فلم اسکرپٹ رائٹر، کہانی کار اور مکالمہ نویس سید آغا جانی کشمیری جو اصلاً لکھنؤ کے تھے، کی سوانح حیات 'سحر ہونے تک' اہتمام سے شائع ہوگئی ہے۔ مرحوم آغا جانی کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے ف۔ س۔ اعجاز مدیر 'انشا' نے یہ کتاب دوبارہ شائع کرکے ایک دور کی بازیافت کی ہے۔ پہلی بار ۱۹۶۶ء میں یہ کتاب شانتی اردو کے ذریعے دہلی سے چھپی لیکن افسوس کہ کسی وجہ سے عام قارئین تک نہیں پہنچی اور اس کا اسٹاک تلف ہوگیا۔ چند برس قبل ماہنامہ 'انشا' میں اس کتاب کا بیشتر حصہ پندرہ قسطوں میں چھپا۔ اس وقت سے لوگوں کو اس کتاب کا بے صبری سے انتظار تھا۔ بظاہر یہ کتاب ایک شخص کی سوانح ہے اور علم وقلم سے سروکار رکھتی ہے لیکن اصلاً اردو زبان وادب کا اعلا شاہکار، ایک عہد کی تہذیب کا شاندار مرقع ہے۔ 'سحر ہونے تک' کی بڑی بڑی ادبی اور فلمی ہستیوں نے داد دی جن میں خواجہ احمد عباس، راجندر سنگھ بیدی، آر کے نیر بھی شامل ہیں۔ یہ بات کم لوگوں کو معلوم ہوگی کہ آغا جانی کشمیری شاعر بھی تھے، بیدل لکھنوی تخلص فرماتے تھے۔ کلکتہ میں بھی کچھ عرصہ ان کا قیام رہا اور وہ نیو تھیٹرز سے جڑے رہے۔ انھوں نے لکھا ہے کہ "جو کچھ مجھ کو ملا ہے وہ صرف لکھنؤ والوں کا، بنگال اور بنگالیوں کا صدقہ ہے۔ لکھنؤ اور کلکتہ نے مل جل کر میرا شاعرانہ مزاج سنوارا اور ہمانسو رائے نے 'بمبئی ٹاکیز' میں شریک کرکے مجھ کو آغا جانی کشمیری بنایا"۔ انھوں نے ہمایوں، تقدیر، انمول گھڑی، پروانے، ہیں پیار کے، غزل، نیا زمانہ، چندر لیکھا، عورت، امر، چوری چوری، لو ان شملہ، جنگلی، مجھے جینے دو، مہندی، اپریل فول، شاگرد، لو ان ٹوکیو، پروانہ، لکھنؤ جیسی فلموں کے لیے منظرنامے یا مکالمے لکھے۔ ان کی سوانح حیات میں کئی بڑے ادیبوں، ہیرو ہیروئنوں، پروڈیوسروں، ڈائرکٹروں کے بھرپور ادبی تذکرے شامل ہیں۔ کتاب کی قیمت اندرون ملک ۲۰۰ روپے، بیرون ملک 10 برطانوی پونڈ یا 15 امریکی ڈالر ہے۔
رابطہ: انشا پبلی کیشنز، 25B، ذکریا اسٹریٹ، کلکتہ - 700073

وزیر تعلیم سے اردو میڈیم سرکاری مدارس کا دورہ کرنے کا مطالبہ

حیدرآباد (۲۶ مئی)۔ سماجی کارکن شیخ عبدالرحمن باوزیر نے اپنے ایک بیان میں وزیر تعلیم مسٹر ڈی پارتھا سارتھی سے گریٹر حیدرآباد کے اردو میڈیم سرکاری مدارس کا دورہ کرنے کا مطالبہ کرتے ہوئے کہا کہ اب چوں کہ موسم گرما میں سرکاری مدارس میں سالانہ تعطیلات ہونے والی ہیں اس لیے ان تعطیلات کے پیش نظر رکھتے ہوئے معزز وزیر تعلیم ڈی پارتھا سارتھی، محکمہ تعلیم کے ڈی ای او کے علاوہ کلکٹر حیدرآباد کو ساتھ لے کر سرکاری اسکولوں کا دورہ کریں کیوں کہ اکثر سرکاری اسکولوں میں پینے کے لیے صاف پانی کا انتظام نہیں، نہ بیت الخلا ہے نہ لائٹ کا معقول انتظام، فرنیچر بھی اکثر اسکولوں میں نہیں ہے، اکثر اسکولوں میں اساتذہ کی بھی کمی ہے۔ جناب شیخ عبدالرحمن نے وزیر تعلیم مسٹر ڈی پارتھا سارتھی، محکمہ تعلیم کے ڈی ای او اور کلکٹر حیدرآباد سے مطالبہ کیا ہے کہ اردو میڈیم سرکاری اسکولوں کا دورہ کرکے ان اسکولوں کی مشکلات کو دور کریں۔
(رہنمائے دکن، حیدرآباد)

اسٹیٹ بینک آف حیدرآباد کی برانچ اعظم پورہ پر اردو سائن بورڈ کی تنصیب

حیدرآباد (۱۰ مئی)۔ آندھرا پردیش اردو کونسل کی نمائندگی پر اسٹیٹ بینک آف حیدرآباد (ایس بی ایچ) ملک پیٹ برانچ اعظم پورہ پر اردو سائن بورڈ نصب کردیا گیا ہے۔ صدر اے پی اردو کونسل سید مجتبیٰ عابدی، آغا دوست علی، سید شکیل عابدی اور محمد مشتاق احمد نے اس ضمن میں چیف منیجر بینک مسٹر اے پی رام کمار کو یادداشت کے ذریعے توجہ دلائی تھی۔ انھوں نے بروقت فیصلہ کرتے ہوئے اردو میں بھی سائن بورڈ نصب کروادیا ہے۔ مجتبیٰ عابدی نے بتایا کہ اردو کونسل کی ہی موثر نمائندگی پر بینک آف بڑودہ چنچل گوڑہ میں بھی تمام کاؤنٹرس پر اردو کو تحریر کیا گیا تھا۔ اس مہم کی نگرانی جناب ایم ایم غوری عارف، اقبال حسنی، جناب ایم ایم احمد خان لال، مجاہد اقبال، مختار احمد فردین، انیس اقبال اور سید شاہ مجاہد حسینی کررہے ہیں۔
(اعتماد، حیدرآباد)

نئی کتابیں

تبصرے کے لیے دو کتابوں کا آنا ضروری ہے

نام کتاب : عبارت
شاعر : کامل بہزادی
ضخامت : ۱۲۰ صفحات
قیمت : ۲۰۰ روپے
ناشر : ادارہ قصرِ ادب 'غزل'
سی-42، اندرو ہار کالونی،
ایئر پورٹ روڈ، بھوپال-32
تبصرہ نگار : اقبال مسعود

اردو غزل کی روایت اس قدر شاندار اور منفرد ہے کہ تقریباً ہر اہم شاعر اس روایت کی وراثت کا احترام کرتا ہے۔ رشید احمد صدیقی نے غزل کو اردو شاعری کی آبرو قرار دیا تھا۔ عصری صورت حال میں غزل نہ صرف شاعری بلکہ اردو زبان و ادب کی آبرو اور ضامن بن گئی ہے۔ غزل کی اس سنہری کڑی میں کامل بہزادی کا نام بھی شامل ہے۔ اردو میں ان کی غزلیہ شاعری کے دو مجموعے، ہندی میں غزلوں پر مشتمل ایک مجموعہ اور تلوک چند محروم پران کی تنقیدی کتاب ان کی ادبی و تخلیقی سرگرمیوں کے سنگ میل ہیں۔

کامل بہزادی کا تازہ مجموعۂ کلام 'عبارت' حال ہی میں منصۂ شہود پر آیا ہے، جو ان کے کمالاتِ سخن کا آئینہ ہے۔ 'عبارت' میں ان کی شاعری اور فن نصف صدی کی کاوشوں کی داستان ہے۔ اس میں انفرادیت بھی ہے اور حسن بھی ہے۔

غزل عہد قدیم سے محبوب سے گفتگو اور معاملاتِ عشق کی مظہر قرار دی گئی ہے۔ کامل بہزادی غزل کی اس شریعت کے پاسدار ہیں، چاہے زمانے کی سنگ دلی ہو یا محبوب کی طرح داری، ان کا سخن محبوب سے گفتگو کا ہی رہتا ہے۔ اس میں کلاسیکی رچاؤ، رشتوں کی پاسداری اور شائستہ لہجے کا عنصر نمایاں ہے اس وجہ سے بعض اوقات یہ دھوکا ہوتا ہے کہ "ان کے موضوعات کا دائرہ قدما، متوسطین اور متاخرین شعرا کی پیروی تک محدود ہے"۔ تاہم موضوعات کے برتاؤ، ڈکشن کے تخلیقی استعمال اور حالاتِ حاضرہ کا ایک سنجیدہ، باخبر اور باعلم فرد کی طرح مطالعے نے ان کے کلام کو منفرد بنادیا ہے۔ انھوں نے اپنی شائستہ روی اور شیریں بیانی سے جو غم ہوا اسے غم جاناں بنانے کا فن سیکھ لیا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ کیجیے:

جگنو، پھول، دھنک، چاند، ستارے، شبنم
کیسے بکھرے ہوئے منظر تری تصویر کے ہیں

میرے اللہ کوئی ایسا کرشمہ کردے
میرے اشعارِ محبت پہ وہ کچھ غور کرے

اب ایسے میں کوئی انصاف کی امید کیا رکھے
تماشا دیکھنے بیٹھا ہے منصف رقصِ بسمل کا

شہر میں اب کے فسادات کے بعد آیا ہوں
کچھ تو پہچان بتانا جو مرا گھر آئے

بات بھی کرتے ہیں یہ کامل بزرگوں کی طرح
اپنے بچوں میں سمجھداری کہاں سے آگئی

ہم عصر شعرا کے تازہ دواوین اور رسائل میں موجود صفحاتِ سخن کو پلٹتے جائیے وہ غزل کی شریعت سے عاری نظر آتے ہیں۔ ہر شعر قتل و خون، غارت گری، فسادات، ظلم و ناانصافی، ماں کی محبت، ماضی پرستی اور محروم رہ جانے کی بیمار نفسیات سے بھرے نظر آتے ہیں۔ اگرچہ یہ عصری حقائق کی سچی تصویریں ہیں مگر ان کو غزل کا شعر کہنا دشوار ہے۔ یہی غزل مشاعروں میں سستی شہرت حاصل کرتی ہے۔ ادب کا، تہذیب کا اور مہذب سماج کا جو وطیرہ ہونا چاہیے اس سے یہ سخن خالی ہیں۔ خوشی کی بات ہے کہ کامل بہزادی نے اس کساد بازاری کے باوجود تہذیب کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا ہے اور اپنے تغزل سے تازہ ہوا کے جھونکوں کا احساس دلایا ہے یہی احساس ان کے تازہ مجموعۂ کلام 'عبارت' میں خوشبو بن کر مہک رہا ہے۔

•••

نام کتاب : صبر
مصنف : شان حیدر بیباک امروہوی
ضخامت : ۱۳۰ صفحات
قیمت : ۱۵۰ روپے
ملنے کا پتا : ضیاء احمد اسلامک بک سینٹر
گذری، امروہہ-244221
تبصرہ نگار : ایم رحمٰن (دہلی)

زیر نظر کتاب بعنوان 'صبر' معروف ادیب اور مخصوص لب و لہجے کے شاعر اور مرثیہ نگار جناب شان حیدر بیباک امروہوی کی کتاب ہے جسے سید حسن بن علی تقوی (رضن) نے بڑے اہتمام سے شائع کیا ہے۔ کتاب کی پیشانی پر مصنف نے قرآنی آیت درج کی ہے:

اِنَّ اللّٰہَ مَعَ الصّٰبِرِیْنَ

ترجمہ: بے شک اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔

صفحہ چار پر انتساب کی تحریر یوں درج کی ہے: "اپنے والدین و اجداد کے نام جن کے سبب یہ شعور حاصل ہوا۔" والدین و اجداد کی یہ دولت ہی آج ان کی ذات اور قلم کی عظمت برقرار ہے۔ 'صبر' کے عنوان سے اس مرثیے میں 84 بند ہیں۔ مسلسل گلی کاوشوں سے موصوف نے علم و فن کی شمعیں روشن کرکے دنیائے ادب کو منور کیا ہے۔ ان کی شاعری منفرد زاویۂ فکر، جدید لب و لہجے اور نئے آہنگ سے متعارف کراتی ہے۔ وہ نئی نسل کے ایک باصلاحیت فرد ہیں جو صرف لکھتے ہی نہیں ہیں بلکہ ان کے لکھنے میں بھی اخلاص ہے۔ وہ قوم و ملت اور نئی نسل کی بیداری کے لیے بھی کوشاں رہتے ہیں۔ ان کی پہلی کتاب کی زبردست پذیرائی کے بعد یہ ان کی دوسری کتاب ہے جو منظرِ عام پر آئی ہے، جس کو انھوں نے 'صبر' کے منظر نامے کا عکس کہا ہے۔ موثر اور دلکش اندازِ بیان نے پوری کتاب کو اہم ادب پارہ بنادیا ہے۔

یہ ایک سچ ہے کہ موصوف غور و فکر کر کے لکھتے ہیں مگر جو لکھتے ہیں وہ ہوش و خرد اور قلب و نظر کے افکار ہوجاتے ہیں۔ ایک بند ملاحظہ کیجیے:

صبر سے ملتے ہیں انسان کو صالح افکار
صبر انساں کو عطا کرتا ہے اعلیٰ کردار
کرنہیں سکتا کوئی شخص بھی اس سے انکار
صبر سے ملتا ہے انسان کو دو عالم میں وقار
صبر انساں جو کرے دنیا میں عزت پائے
بعد مرنے کے وہ اللہ سے جنت پائے

بند میں بیباک کا اپنا منفرد رنگِ سخن جھلکتا ہے اور صبر کی فضا بھی موجود ہے۔ اس میں فلسفۂ حیات و ممات پر بحث کی گئی ہے۔ زبان و بیان کی روانی اور اشعار کی برجستگی اس مرثیے کا خاص وصف ہے۔

صبر کرتے ہی رہے ہوتے ہوئے رخصت عباس
کس قدر کرتے ہو تم مجھ سے محبت عباس
بھائی اب تک نہ کہا مجھ کو ہے چاہت عباس
آج تو کردو یہ پوری مری حسرت عباس
حکم صبر نے وہ طرزِ سخن چھوڑ دیا
بھائی ایک بار کہا غازی نے دم توڑ دیا

بند میں شاعر کا درد بولتا ہے۔ یہاں غم و اندوہ کی ایک عجیب فضا ہے، اس سے تڑپ، بے بسی اور محبت کی شدت کی عکاسی بخوبی ہوجاتی ہے۔ یہ 'صبر' کا مرثیہ ہے جس میں جذبات نگاری، مکالمہ نگاری، واقعہ نگاری اور عظیم کردار نگاری ہے۔

شان حیدر بیباک نے نعت، نوحے، سلام، مرثیہ، رباعیات، قطعات، نظم جدید، طنز و مزاح اور غزل بھی اصنافِ ادب میں طبع آزمائی کی ہے۔ ڈاکٹر عظیم امروہوی کتاب کے صفحہ ۹ پر رقم طراز ہیں: "مرثیے کے دامن کو بیسویں صدی میں جو وسعت 'جدید مرثیے' کے عنوان سے حاصل ہوئی ہے اس کی مثال ہمارے ادب میں کہیں نہیں ملتی اور صرف غیر اخلاقی مضامین کے علاوہ ہر قسم کے مضامین کے لیے مرثیے نے اپنے دروازے کھول دیے ہیں"۔

اس ضمن میں موصوف کہتے ہیں کہ "حقیقت یہ ہے کہ اردو والوں نے مرثیے کو دور سے دیکھا اور صرف واقعۂ کربلا کا بیان، امام حسین کی قربانی رونے رلانے والی صنفِ سخن کہتے رہے، کبھی مرثیے کے قریب نہیں آئے اور دور سے دیکھنے کے سبب انھیں مرثیے کی معرفت حاصل نہیں ہوسکی۔ یہ ایک ایسی صنفِ سخن ہے جو اپنے دامن میں تمام اصنافِ سخن کی خصوصیات کو سمیٹے ہوئے ہے، اس میں حمد الٰہی بھی ہے، اس میں نعت رسول بھی ہے، اس میں منقبتِ انبیا، ائمہ و دیگر بزرگانِ دین بھی"۔

میری سمجھ میں جو بات آتی ہے وہ یہ کہ ڈاکٹر موصوف نے نہایت ہی فراخ دلی سے مرثیے کی یہ تعریف پیش کی ہے تاکہ ذہن میں بدگمانی نہ پیدا ہو۔ بیباک کے پرواز تخیل پر جائیں تو پتا چلتا ہے کہ بیباک نے ٹاپک پر ہی مصرع سجادیا: "صبر انسان کو جینے کی ادا دیتا ہے"۔ الغرض بیباک نے جذبات کو صبر کے خوب صورت سانچے میں ڈھال کر پیش کیا ہے۔ امید ہے کہ ان کے اس پہلو کو قدر کی نگاہ نصیب ہوگی۔

کتاب کا سرورق جاذب نظر ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ 'صبر' اپنے موضوع پر نہایت مدلل، معیاری اور حقائق سے پر ہے۔

•••

بقیہ: داراشکوہ کا دربار

صفحہ ۲ سے آگے

اس پر قابض ہوجائیں گے۔ آپ پوری طاقت سے ادھر گئے۔ ادھر اہل دکن اور مرہٹے اور جاٹ جو ہماری ذرا ذرا سی نقل و حرکت کی ٹوہ لیا کرتے ہیں، موقع میدان خالی دیکھ کر آ دوڑے۔ بتلایے اس وقت ہند کی سلطنت کیا کرے گی۔ کیا قلعے کی دیواریں لڑیں گی یا قلم پکڑنے والے حصدی یا سودا بیچنے والے سوداگر؟ جہاں پناہ! میں ڈاکٹر صاحب سے اتفاق کرتا ہوں کہ سلطنتوں کو اپنا سکہ بٹھانے کی کوشش کرنی چاہیے۔ بیشک اگر ان کی دھاک بندھ جائے تو بہت مفید ہے۔ مگر کیا اس کے لیے سلطنت ہی کو معرضِ خطر میں ڈالنا مصلحت ہے۔ اگر ملک کی اصلی طاقت کو ضرر پہنچائے بغیر آپ اپنا رعب بٹھاسکتے ہیں تو شوق سے بٹھایے مگر میں ایک بار نہیں سو بار کہوں گا کہ اگر ایسا کرنے سے ملک کمزور ہوتا ہو تو اس کا خیال ہی نہ کیجیے۔ دو مہموں کا ناکام ہوجانا صاف ثابت کرتا ہے کہ قندھار کا فتح کرنا کچھ آسان نہیں۔ دونوں دکن کی قریب قریب آدھی صدی کی خوں ریزیوں کے مقابلے کے لیے تیار رہنا ان کی اندرونی طاقت کا بین ثبوت ہے۔ میں ڈنکے کی

ہوں لیکن قندھار کو نہ چھوڑیں گے نہ چھوڑیں گے۔ ساری دنیا زیر و زبر ہوجائے مگر قندھار کو نہ چھوڑیں گے۔ دنیا بھر متفق ہوجائے۔ ہم مٹی میں مل جائیں مگر قندھار ہم سے نہ چھوٹے گا"۔

حضرت! اغور تو کیجیے یہ مصلحت ہے ایک چھوٹے سے صوبے کے لیے، ایک عظیم الشان سلطنت کو خطرے میں ڈالنا۔ میں یہ نہیں کہتا کہ خطرہ نزدیک ہے۔ مگر خطرہ سر پر بھی ہوتا تو ڈاکٹر صاحب کے قول کے مطابق ہندوستان کو جان پر کھیل جانا چاہیے تھا۔ یہ مصلحت نہیں، مصلحت ملکی اسے کہتے ہیں کہ سانپ مرے اور لاٹھی نہ ٹوٹے۔ مانا کہ آپ نے دوبارہ قندھار کو ایک زبردست مہم روانہ کی۔ فرض کیجیے معاملہ نے طول کھینچا۔ والیِ ایران اپنی پوری طاقت سے آڈٹا تو آپ کو کمک کی ضرورت ہوئی، اس طرح آٹھ مہینے گزر گئے، نویں مہینے میں جب برف پڑنے لگی تو آپ کو مجبوراً ہٹنا پڑا اور غنیم نے اس موقعے سے خوب دل کھول کر فائدہ اٹھایا۔ بتلایے بجز ذلت و خواری و ناکامی کے کیا ہاتھ لگا۔ آپ کہیں ہم پوری طاقت سے قندھار پر چڑھیں گے اور آٹھ مہینے کے اندر ہی

چوٹ پر کہتا ہوں کہ یہ سلطنت ان دونوں صعب دشمنوں کا مقابلہ ایک ساتھ نہیں کرسکتی۔ قندھار اور دکن دونوں پر فتح پانا محال ہے۔ ان میں سے ایک لے لیجیے قندھار یا دکن، میری صلاح یہ ہے کہ دکن کو قندھار پر ترجیح دیجیے۔

جہاں پناہ! میرا خیال ہے کہ دنیا کی ہر ایک نامور قوم کا زوال اسی وجہ سے ہوا کہ اس نے اپنی گلی کے باہر پاؤں پھیلانے کی کوشش کی۔ ان کی اولوالعزمیاں حرص وطمع کے درجے تک پہنچ گئیں۔ ایران، یونان، اطالیہ، روم ہر ایک نے اعتدال سے زیادہ پاؤں پھیلائے۔ محض جنگی قوت وزور شمشیر سے دور دراز ملکوں پر قابض رہنا چاہا، مگر کیا نتیجہ ہوا، ان کو زیر کرنے کے زعم میں اپنی طاقت کو کھو بیٹھے حتیٰ کہ نہ صرف اپنے مفتوحات ہی سے ہاتھ دھونا پڑا بلکہ اپنے جتنے کو بھی رو بیٹھے ان کا نام صفحۂ ہستی سے ہمیشہ کے لیے مٹ گیا۔ ہم کیوں اس غلطی میں پڑے؟ کیوں نہ دوسری قوموں سے عبرت حاصل کرے؟ ہندستان کا ملک بہت وسیع ہے اگر ہندستان کی آبادی پچیس برس میں بھی دوگنی ہوجائے تو صدیوں تک تنگی کی شکایت نہ سننے میں آئے گی۔ قندھار کو ہمالک محروسہ میں شامل کرنا مصارف جنگی کو دوچند کرنا ہے کیوں کہ وہاں کی کوہستانی قومیں ہمیشہ عناد وفساد کا بازار گرم رکھیں گی اور ان شورشوں کو زیر کرنے کے لیے ایک زبردست فوج رکھنی پڑے گی۔ پس محض سلطنت کو وسیع کرنے کے خیال سے قندھار پر حملہ آور ہونا یا مہمیں روانہ کرنا میری دانست میں مناسب نہیں''۔

(باقی آئندہ)

بقیہ: مظہر امام: ایک مطالعہ

صفحہ ۳ سے آگے

کے بھی برصغیر ہندو پاک میں جانے اور پہچانے جاتے ہیں۔ وہ ایک محقق بھی ہیں اور نقاد بھی۔ انھوں نے خاکے بھی لکھے ہیں اور مونوگراف بھی۔ وہ ایک تبصرہ نگار کی حیثیت سے بھی معروف ہیں اور دیباچہ نگاری میں بھی مہارت رکھتے ہیں۔ اپنی شاعری کی طرح نثر کی گوناگوں اصناف میں انھوں نے طبع آزمائی کی ہے۔ اردو ادب میں موجودہ دور کے محققوں اور نقادوں میں مظہر امام کا خاص طور پر شمار ہوتا ہے۔ 'آتی جاتی لہریں'، 'ایک لہر آتی ہوئی'، 'اکثر یاد آتے ہیں'، 'جمیل مظہری' (مونوگراف) اور 'آزاد غزل کا منظرنامہ' (تنقید نما) تحقیق وتحسین سے متعلق اُن کی تصانیف ہیں۔ ان تصانیف کے مطالعے سے یہ بات مترشح ہوتی ہے کہ وہ شاعری کے ساتھ ساتھ تنقیدی وتحقیقی شعور بھی رکھتے ہیں۔ اُن کے مضامین میں جس طرح کا خلوص وانہماک ملتا ہے وہ اس بات کی ضمانت ہے کہ وہ ایک باصلاحیت تنقید نگار ہیں اور اپنی پوری ذمہ داری سے تحقیق کا حق ادا کرتے ہیں۔ ان میں تلاش وجستجو کی ایک انتھک لگن موجود ہے۔ اُن کی نثری تحریروں میں توازن اور اعتدال پایا جاتا ہے۔ 'آتی جاتی لہریں' میں گو ان کے فکر انگیز مقالات ہیں۔ ان میں سے بعض مقالات اپنے دور میں نہایت ہی متنازعہ فیہ رہے ہیں۔ ان کی بدولت بحث و تمحیص کے ایسے دفتر کھل گئے ہیں کہ اُن کی حمایت اور مخالفت میں اُس زمانے کے معیاری رسائل میں مدلل مضامین شائع ہوئے۔ 'آتی جاتی لہریں' اور 'ترقی پسندی سے جدیدیت تک' جیسے مضامین میں گہرا فنکارانہ شعور ملتا ہے۔ 'آزاد غزل پر ایک نوٹ' تحقیقی نوعیت کا مضمون ہے جس میں اس نئے تجربے کے بارے میں مظہر امام اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہیں۔ مظہر امام، شاد عظیم آبادی کو نئی غزل کے پیش رو تسلیم کرتے ہیں اور مثالوں سے یہ بات ثابت کرتے ہیں کہ انھوں نے اردو غزل میں کئی تبدیلیاں لائی ہیں۔ مظہر امام کے مطابق پرویز شاہدی سے کافی ناانصافی ہوئی ہے اور وہ نقادانِ فن کے مقتول بن گئے ہیں۔ وہ سلام مچھلی شہری کو زود نویس قرار دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اُن کا بہترین کلام اُن کے معمولی کلام کے انبار میں گم ہوگیا ہے۔ سلام کی شاعری کے بارے میں مظہر امام واضح نظر یہ رکھتے ہیں۔ وہ سلام کے ساتھ ہوئی ناانصافیوں کا بھی ذکر کرتے ہیں اور اُن کی بُری عادات کا بھی، جن میں ایک بُری عادت اُن کی بے تحاشا شراب نوشی تھی، جس نے اُن کو برباد کرکے رکھ دیا۔ مظہر امام کہتے ہیں کہ اُن پر ازسرِنو تحقیق کرنے کی ضرورت ہے تاکہ اُن کا معیاری کلام قارئین کے سامنے آجائے۔ اس مضمون میں مظہر امام نے سلام مچھلی شہری کی شخصیت اور فن پر مدلل بحث کی ہے اور بہت سارے ایسے گوشے سامنے لائے ہیں جو پوشیدہ تھے۔

مظہر امام دورِ جدید کے شاعر محمد علوی کو آگہی کا شاعر قرار دیتے ہیں۔ علوی کی شاعری میں اُن کو بہترین امکانات نظر آتے ہیں۔ 'آتی جاتی لہریں' میں مظہر امام نئے اردو افسانے پر بھی مدلل بحث کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ علی عباس حسینی، اختر اورینوی اور عصمت چغتائی کی افسانہ نگاری پر بھی تبصرہ کرتے ہیں اور اردو افسانے میں ان فن کاروں کا مرتبہ متعین کرتے ہیں۔

'مخمور جالندھری کی شاعری کا اولین دور' میں مظہر امام بے باکی سے اُن کے شعری مجموعے 'جلوہ گاہ' پر تنقید کرتے ہیں اور قارئین کو نہ صرف اُن کی شعری خوبیوں سے لطف اندوز ہونے کا موقع فراہم کرتے ہیں بلکہ اُن کی خامیوں سے بھی آگاہ کرتے ہیں۔ مظہر امام کو اُن کی شاعری میں سب سے پہلے جو خوبی محسوس ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ ان کی شاعری اُن کے اکثر معاصرین کے علی الرغم ابہام اور بعید از قیاس اشاریت سے پاک ہے۔ مظہر امام کے مطابق جنسیات مخمور کا خاص میدان رہا ہے اور اُن کی اکثر نظموں میں یہی تاثر ہر جگہ نمایاں ہے۔ اُن کی شاعری میں کہیں کہیں غیر ضروری الفاظ اور بے جا وضاحتیں بھی ملتی ہیں۔ انھیں مخمور کی شاعری میں راشد، میراجی اور سلام مچھلی شہری کے اثرات نظر آتے ہیں۔ مظہر امام اُن کی شاعری میں تفکر کی کمی اور حشو وزوائد کی بہتات پاتے ہیں۔ وہ 'جلوہ گاہ' پر بے لاگ تنقید کرتے ہیں اور یہ نتیجہ اخذ کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ شاعرانہ خامیوں کے باوجود مخمور اس دنیا کے شاعر ہیں۔ وہ طلسماتی فضاؤں میں پرواز نہیں کرتے بلکہ اُن کی شاعری میں اسی مٹی کی بوباس ملتی ہے۔

'کلیم الدین احمد کی شاعری پر ایک نظر' بھی قابلِ مطالعہ مضمون ہے۔ ڈاکٹر امام اعظم کو اس مضمون میں توازن اور اعتدال کی کمی نظر آتی ہے جو کسی حد تک صحیح ہے، لیکن یہ کہنا غلط ہے کہ اس مضمون کے بعض حصوں سے تعصب کی بو آتی ہے۔ مظہر امام چوں کہ حقیقت بیانی سے کام لیتے ہوئے یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں اس لیے 'کلیم الدین احمد کی شاعری پر ایک نظر' میں بھی انھوں نے یہی روبہ اختیار کیا ہے اور کلیم الدین احمد کی شاعری کی بہت ساری خامیوں کی طرف اشارہ کیا ہے۔ کلیم الدین احمد نے اگر عظیم جانے کے اردو شعرا کے مصرعے اپنے کھاتے میں شامل کیے ہیں تو ایک فن پارے کو پرکھنے والے پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ اس کی نشان دہی کرے۔ مظہر امام نے اگر اس تنقیدی میزان کو اپنایا تو میرے خیال میں اعتراض کی کوئی گنجائش نہیں۔

مظہر امام نے اپنے مضامین 'ادب اور بھارت' اور 'سرائے کے باہر' میں بھی یہی رویہ اختیار کیا ہے۔ ان دونوں مضامین سے فلم، آرٹ، ڈرامہ اور صحافت سے متعلق بہت ساری باتوں کی جانکاری ہوتی ہے۔ مظہر امام ان تمام شعبوں پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ وہ صحافت سے بھی وابستہ رہے ہیں اور ٹیلی ویژن کی وساطت سے فلم اور آرٹ سے بھی، اس لیے انھوں نے ان شعبوں کے آپسی تال میل سے متعلق بعض اہم باتوں کی نشان دہی کی ہے۔ 'ادب اور بھارت' بھی مظہر امام کے بعض دوسرے مضامین کی طرح نہایت ہی متنازعہ فیہ مضمون رہا ہے۔ یہ دراصل ماہنامہ 'صنم' کے 'بہار نمبر' پر سیر حاصل تبصرہ ہے جو پٹنہ سے شائع ہوا تھا۔ مظہر امام کے مطابق 'صنم' کا یہ خاص نمبر صوبائی تنگ نظری یا عصبیت کا شکار ہے۔ یہ جریدہ ضخیم ہونے کے باوجود بھی اپنی پہچان نہ بنا سکا۔ اس کی وجہ مظہر امام کے نزدیک یہ ہے کہ مدیران 'صنم' نے محنت اور کاوش سے پہلوتہی کی ہے۔ لہٰذا یہ نمبر معنوی اور صوری دونوں خوبیوں سے محروم رہا ہے۔ مظہر امام نے یہاں بھی صاف گوئی سے کام لیا ہے اور اپنی رائے بلا جھجک، واضح الفاظ میں دی ہے۔ اسی طرح سے مظہر امام 'سرائے کے باہر' کو ۱۹۶۲ء کی ناکام ترین فلم کا درجہ دیتے ہیں۔

(باقی آئندہ)

انجمن ترقی اردو (ہند) کی چند مطبوعات

پہلا ورق (سہ ماہی 'اردو ادب' کے منتخب اداریے) اسلم پرویز		
انتخاب وترتیب: شمس الحق عثمانی، محمد فیروز دہلوی		۳۰۰/=
راس مسعود	حکیم سید ظل الرحمٰن	۲۵۰/=
ناہکل	اطہر فاروقی	۲۲۰/=
سیرت فریدیہ (سرسید کے نانا خواجہ فریدالدین احمد خاں اور دیگر افرادِ خاندان کے حالات)		
مصنف: سرسید احمد خاں، مرتب: خلیق انجم		۱۵۰/=
ہندستان میں اردو سیاست کی تفہیم نو	اطہر فاروقی	۲۹۰/=
انقلاب: ایک تاریخ، ایک تہذیب کی کہانی	عابد اللہ غازی	۸۵/=
بلیک ہول (ماحولیاتی آلودگی پر ایک طویل ورس)	ڈاکٹر مظفرالدین فاروقی	۱۲۰/=
دوکانِ شیشہ گراں (کتابیں اور لوگ)	شمیم حنفی	۲۰۰/=
دلی کے محاورے	سید ضمیر حسن دہلوی	۱۰۰/=
مجھے سب ہے یاد ذرا ذرا	خلیق انجم	۲۳۰/=
سن ستاون کی دلی اور بہادر شاہ ظفر	اسلم پرویز	۱۵۰/=
آزاد ہندستان میں اردو زبان، تعلیم اور صحافت	اطہر فاروقی	۱۷۰/=
ہندستان میں فکری وتہذیبی اصلاح کا آغاز اور ماسٹر رام چندر		
	صدیق الرحمٰن قدوائی	۱۸۰/=
The Court of Inder [اندر سبھا] (سید آغا حسن امانت)		
	اقروز تاج	۳۰۰/=
اردو ہے جس کا نام (رباعیات کا مجموعہ)	امیر چند بہار	۱۱۰/=
پریم چند گھر میں (شو رانی دیوی)	مترجم: سید حسن منظر	۲۰۰/=
ادب کی سماجیات: تصور اور تعبیر (منیجر پانڈے)	مترجم: سرور الہدیٰ	۲۰۰/=
دلی کے مسلمان دانشور (انیسویں صدی) مصنف: مشیر الحسن		
	مترجم: مسعود الحق	۲۲۵/=
گفتگو اُن کی	اطہر فاروقی	۱۵۰/=

مشفق خواجہ کی شاعری کا مختصر تعارف

ڈاکٹر سید لطیف حسین ادیب (73، پھول والان، بریلی (یوپی) 243003)

نام عبدالحئی۔ تخلص مشفق، نام مشفق خواجہ۔ پیدائش لاہور ۱۹ دسمبر ۱۹۳۵ء۔ وفات کراچی ۲۱ فروری ۲۰۰۵ء۔ مشفق خواجہ ایک محقق، صحافی اور کالم نگار کی حیثیت سے معروف ہیں۔ وہ شاعر بھی تھے جس کا علم شاید کم لوگوں کو ہے۔ ان کے مجموعۂ کلام کا نام 'ابیات' ہے جو اس وقت پیش نظر ہے۔ 'ابیات' میں ان کا ۱۹۵۰ء سے ۱۹۷۸ء تک کا کلام شامل ہے۔ 'ابیات' کی اشاعت ۱۹۷۸ء میں ایجوکیشنل پریس کراچی میں ہوئی تھی۔ 'ابیات' کے صفحات کی تعداد ۱۵۱ ہے جس میں منثور دیباچہ یا مقدمہ نہیں ہے، البتہ منظوم دیباچہ مندرجہ ذیل ہے:

یہی غزل مری محرومیوں کا نوحۂ غم
یہی غزل مرا آئینۂ جمال بھی ہے
جو پا سکا نہ تجھے میں تو کھو دیا خود کو
یہ میرا ہجر بھی ہے میرا کمال بھی ہے

دیباچے سے ان کی داخلی کیفیت کا پتہ چلتا ہے یعنی محرومیوں کا نوحۂ غم اور اپنی ذات سے وارفتگی جب کہ خارجی کیفیت یعنی اسلوب سخن کے متعلق ان کا یہ شعر جو انھوں نے دیباچے کے بعد بدون عنوان درج کیا ہے:

کمال بے ہنری بھی ہنر سے کم تو نہیں
مرا شعار نہیں ہو سکے یہ غم تو نہیں

ان کے کمال ہنری کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ منثور دیباچہ اور مقدمے کی عدم موجودگی میں 'ابیات' مروجہ ترتیب کے مطابق نہیں ہے۔ یہ بے ترتیبی پوری کتاب میں ملتی ہے جس کا اندازہ مندرجہ ذیل شماریات سے ہوتا ہے:

متقدمین کے دواوین میں ایک غزل میں پانچ اشعار سے کم نہیں ہوتے تھے۔ طاق تعداد میں اس سے زیادہ اشعار بھی ہو سکتے تھے۔ دو غزلہ، سہ غزلہ کا بھی رواج تھا۔ دیوان کی ترتیب ردیف وار الفبائی ہوتی تھی۔ ہر غزل میں مطلع اور مقطع ہوتا تھا۔ 'ابیات' ان قیود سے آزاد ہے۔ 'ابیات' میں 72 غزلیات ہیں۔ آخر میں ۵ فردیات ہیں۔ ہر غزل میں مطلع ضرور ملتا ہے لیکن مقطع صرف تین غزلیات میں ہے۔ تعداد اشعار کے لحاظ سے ایک غزل میں کم سے کم دو اشعار اور زیادہ سے زیادہ نو اشعار ہیں۔ صرف چار غزلیں طویل بحر میں ہیں جب کہ باقی غزلیں چھوٹی بحروں میں ہیں۔ فردیات کی تعداد 29 ہے۔

شیکسپیئر کے مشہور کردار ہیملٹ کے متعلق کہا گیا کہ اس کے پاگل پن میں سلیقہ تھا۔ کیا روایتی مدونین سے یہ برگشتگی اور کمال بے ترتیبی کسی ہنرمندی کا اشارہ ہے۔

بہ ظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ 'ابیات' شاعر کا منظوم روزنامچہ ہے یا ایسی بیاض ہے جس میں اُس نے 17 سال کی عمر سے 42 سال کی عمر تک کی مدت میں وقت بے وقت نازل ہونے والے اشعار کو ان کی اصل سلسلہ وار ترتیب کے ساتھ مرتب کر کے شائع کروا دیا۔ چوں کہ سلیقۂ سخن کوئی منفرد ہے:

یہ الگ بات ہے میں تجھ کو منا بھی نہ سکوں
تیری خاطر کبھی جب شعر کہا ہے میں نے

اور کیفیات سخن خوردہ برگ حنا کی مانند جن میں شاعر کے جگر کا لہو شامل ہو گیا ہے، 'ابیات' کے اشعار اپنی کیفیت میں ایک ہی محیط کے لہو رنگ سوتے معلوم ہوتے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ 'ابیات' غزل کے روایتی مضامین اور روایتی اسلوب نگارش سے عاری ہے۔ روایتی غزل میں وفاداری و بے وفائی، وصل و فراق، خوشی و غم، فلسفہ، تصوف وغیرہ کے مضامین نظم کیے جاتے تھے۔ مضامین نو اور تخیل طرازی کو بھی جگہ دی جاتی تھی۔ اظہار مدعا روزمرہ اور بامحاورہ زبان کے علاوہ پُرتصنع زبان میں بھی کیا جاتا تھا۔ غزل اپنے انیق و دقیق اسلوب میں مختلف النوع داخلی و خارجی کیفیات کا مجموعہ تھی۔

'ابیات' میں صرف کیفیات ہیں جن میں شاعر کے جگر کا لہو شامل ہو گیا ہے۔ کیفیات کی یہ باطنی لہو تابی ہی غزل کا تصوف ہے۔ ہر غزل ایک سلیقہ ہے۔ ہر غزل 'خواب و خیال کا پیچ ابھن' ہے۔ اس پیچ ابھن تراشی میں شاعر نے جو تراکیب وضع کیں وہ بھی روش عام سے بعید ہیں اور ان کی صوتی و معنوی اثر انگیزی معراج پر ہے، مثال میں: قریۂ خواب پریشاں، خاک ستارہ بار، سر جادۂ احساس، مسافران شب تار، طلوع صد آفتاب منتظر، خواب دل سودائی، نفس خوش انفاس، وسعت جلوہ گہ ناز، خلوت بے خواب، ساز دل اہل تمنا، حسن چشم توجہ، وہی پردۂ بے رنگی، گل مژدۂ یاس۔

تراکیب کی صوتی و معنوی اثر انگیزی کے ثبوت میں مندرجہ ذیل دو اشعار ایک غزل کے:

ان کا جو اہتمام سے ہرگز کرے کہ وہ سوچ کوئی بھی
کب خاک ستارہ بار ہوئی کب سر چراغ آرہوئے
کب صبح کے دامن کے کام آئے، کیا گریۂ شبنم بھی ہے
اہل قریۂ خواب پریشاں میں جو جس کے لیے بیدار ہوئے

شاعر نے تراکیب کی اس حسن تخلیق سخن آفرینی کے علاوہ ملازمہ کا استعمال بھی بھرپور ایمائیت کے ساتھ کیا ہے: دیوار، دیوار و در، گھر، مکان، دروازہ، دستک۔ ان کے توسط سے بے رونق زندگی اور تنہائی، وارفتگی کے باوصف زندگی گزارنے کا حوصلہ دیتے ہیں۔ مثال میں:

ہزار بار خود اپنے مکاں پہ دستک دی
اس احتمال میں جیسے کہ میں ہی اندر تھا

میں آپ ہی دروازہ ہوں اور آپ ہی دستک
اور آپ ہی بیٹھا ہوں یہاں منتظر اپنا

یہ حال ہے مرے دیوار و در کی وحشت کا
کہ میرے ہوتے ہوئے بھی مکان خالی ہے

تم اپنے گھر کے دریچے میں کیا کھڑے ہو یوں
چراغ کی صورت جلا کے آئے ہو کیا بجھا دو گے

فقط غم بھی وہی، میں بھی وہی، دل بھی وہی
پر وہ پہلا سا خلوص در و دیوار نہیں

زندگی اپنی بہرحال گزر جائے گی
تو نہ ہوگا تری دیوار کا سایہ ہوگا

پہلے ہی تازہ ہوا آتی تھی کم، اس پر ستم
گھر کی دیواروں کو ہم نے اور اونچا کر لیا

مشفق خواجہ کو تخیل کی مصوری میں بھی کمال حاصل تھا۔ اپنی جگہ یہ امر بحث ہے کہ اس مصوری میں شاعر کی داخلی کیفیات شامل رہتی ہیں۔ مثال میں:

وقت کتنا ہے سیہ خانے کی راتوں کی طرح
سب ہے گردش میں یہ دن رات کے ساغر کیا کیا

اداس راہوں سے زندگی کی تعلق اپنا ہے اس طرح کا
کہ جیسے درماندہ راہرو کی قدم اٹھائے نظر جھکائے

مشفق خواجہ کے اشعار کا عام اسلوب سادہ اور سہل ہے۔ بعض اشعار پر ضرب المثل کا گمان ہوتا ہے۔ مثال میں:

شاداں تم بھر کون ہوگا
مجبور ہو کر جینا پڑا ہے

چہرہ تو چمک رہا ہے
اندر سے یہ شخص بجھ چکا ہے

دل کا لہو آنکھ سے بہا ہے
کاغذ پہ جو حرف بنا ہے

مسکراتا ہوا بات بات پہ میں
یہ کسی غم کی ابتدا تو نہیں

ایک دل اور ہزاروں بازیں
زندگی بار گراں ہے جو تھی

غم کے لیے اگر نہ جیتے ہیں
زندگی کتنی مختصر ہوتی

ہم وہ اہل ادا ہیں کہ جینے کے لیے
خواب کو خواب کی تعبیر سمجھ لیتے ہیں

ہم لوگ جانتے ہیں حقیقت حیات کی
ہم لوگ آنسوؤں میں جلاتے رہے دیے

مختصر سا کوئی قصہ ہے کہانی دل
گر بیاں کیجیے تو عمر ابد بھی کم ہے

ماتم کش تعلق مرگ مسلسل ہی سہی
زیست کرنے کو سلیقہ تو سکھا دیتی ہے

زندہ رہنے کی صورت ہے تو بڑی بات ہے یہ
ورنہ جاں سے تو گزرنا کوئی دشوار نہیں

ہر راستے کی ہے ایک منزل
اور گمرہی بھی اک راستہ ہے

غزل کے لہجے میں ہوتی تھی گفتگو اس سے
وضاحتوں میں بھی ابہام رہ ہی جاتا تھا

ہم کو اک عمر نہ جینے کا سلیقہ آیا
ہم نے اک عمر تمنا کے سے دکھ کاٹے

میرے حالات پہ تنقید بجا ہے، لیکن
تم پہ مشکل کوئی صاحب نظراں گزری ہے

راقم الحروف کو مشفق خواجہ نے 'ابیات' کا نسخہ ۲۷ اکتوبر ۱۹۷۸ء کو بھیجا تھا جیسا کہ ان کے دستخط کی تاریخ سے معلوم ہوا۔ اس کے بعد یہ نسخہ کتابوں کے انبار میں گم ہو گیا۔ اتنے طویل عرصے کے بعد جب برآمد ہوا تو اس کو متعارف کرانا ضروری معلوم ہوا۔ ان کے کلام سے متعارف ہونے کے بعد معلوم ہوا کہ وہ شاعر بھی باکمال تھے۔ 'ابیات' ان کی ادبی عظمت میں باعث اضافہ ہے۔

●●●

مدیر: اطہر فاروقی
شریک مدیر: محمد عارف خاں
پرنٹر پبلشر: شاہد خاں — مطبوعہ: ثمر آفسیٹ پرنٹنگ پریس، دہلی
مالک: انجمن ترقی اردو (ہند)، اردو گھر ۲۱۲-راؤز ایونیو، نئی دہلی-۱۱۰۰۰۲
قیمت (فی شمارہ): دو روپے، سالانہ: ۸۵ روپے (بیرونی ممالک: آٹھ امریکی ڈالر)
Phones: 23237210, 23236299, Fax: 011-23236299
E-mail: hamarizaban@anjumantaraqqiurduhind.org
http://www.anjumantaraqqiurduhind.org